

بخل

بخل کے معنی ہیں ہاتھ بند کر کے رکھنا (tight fist) اور کنجوسی (miserliness) دکھانا۔ بخل کی مذمت کا ذکر ہمیں قرآن و احادیث میں ملتا ہے:

سورہ آل عمران آیت ۱۸۰ میں ارشاد ہوا:

{ وَلَا يَخْسِرَنَّ الَّذِينَ يَبْخُلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُمْ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخُلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَاللَّهُ مِيرَاثِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ }

”جو لوگ اُس مال میں جو اللہ نے اپنے فضل سے ان کو عطا فرمایا ہے بخل کرتے ہیں وہ اس بخل کو اپنے حق میں اچھا نہ سمجھیں۔ بلکہ یہ ان کے لیے بُرا ہے وہ جس مال میں بخل کرتے ہیں، قیامت کے دن اس کا طوق بنا کر ان کی گردنوں میں ڈالا جائے گا۔ اور آسمانوں اور زمین کا وارث اللہ ہی ہے اور جو تم عمل کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔“

سورہ النساء آیت ۳۷ میں آتا ہے:

{ الَّذِينَ يَبْخُلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُونَ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا }

”جو لوگ خود بخل کرتے ہیں اور دیگر انسانوں کو بھی بخل کا حکم دیتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے ان کو اپنے فضل سے عطا کیا ہے، اس کو چھپاتے ہیں۔ تو تیار کیا ہے ہم نے ایسے ناشکروں اور کافروں کے لیے اہانت آمیز عذاب، رسوا کن عذاب۔“

اسی طرح سورہ محمد ﷺ میں فرمایا:

{ هَآئِنَّكُمْ هَآؤِلَاءَ لَئِنْفَقَوْا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَمِنْكُمْ مَنْ يَبْخُلُ وَمَنْ يَبْخُلْ فَإِنَّمَا يَبْخُلُ عَنْ نَفْسِهِ } (محمد: ۳۸)

”دیکھو تم وہ لوگ جو بوجہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو بلائے جاتے ہو تو تم میں ایسے شخص بھی ہیں جو بخل کرنے لگتے ہیں اور جو بخل کرتا ہے وہ اپنے آپ سے بخل کرتا ہے۔“

اسی بخیلی اور کنجوسی کی تصویر سورہ ہمزہ میں کھینچی گئی ہے کہ جو شخص مال جمع کرتا ہے اور گن گن کر رکھتا ہے، اس کا کیا حال ہوگا۔

{ وَبَيْنَ كُلِّ هُمُةٍ لُمُةٌ } الَّذِي جَبَّحَ مَا لَا وَعَدَّ دَاوُدَ {

”بڑی خرابی ہے ہر ایسے شخص کی جو عیب ٹٹولنے والا نغیبت کرنے والا ہو۔ جو مال جوڑتا اور اس کو گن گن کر رکھتا ہے۔“

ترمذی کی ایک حدیث جو کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اُس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((السَّخِيُّ قَرِيبٌ مِنَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِنَ الْجَنَّةِ قَرِيبٌ مِنَ النَّاسِ بَعِيدٌ مِنَ النَّارِ وَ الْبَخِيلُ بَعِيدٌ مِنَ اللَّهِ بَعِيدٌ مِنَ الْجَنَّةِ بَعِيدٌ مِنَ النَّاسِ قَرِيبٌ مِنَ النَّارِ))^(۱)

”سخی شخص اللہ کے قریب ہوتا ہے، جنت کے قریب ہوتا ہے اور لوگوں سے بھی قریب ہوتا ہے جب کہ آگ سے دور ہوتا ہے اور بخیل اللہ سے، جنت سے اور لوگوں سے دور ہوتا ہے اور آگ سے قریب ہوتا ہے۔“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک اور حدیث مروی ہے کہ:

((لَا يَجْتَمِعُ الشُّخُّ وَالْإِيْمَانُ فِي جَوْفِ رَجُلٍ مُسْلِمٍ))^(۲)

”بخل اور ایمان کسی مسلمان آدمی کے دل میں اکٹھے نہیں ہو سکتے۔“

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ لوگوں سے پوچھا بتاؤ تمہارا سردار کون ہے؟ انہوں نے کہا کہ فلاں ہمارا سردار ہے، وہ بہت اچھا آدمی ہے لیکن بخیل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بخیل شخص سید نہیں ہو سکتا، یعنی سردار نہیں ہو سکتا۔

ترمذی کی ایک اور حدیث جس کے راوی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، اُس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ حَبٌّ وَلَا مَنَانٌ وَلَا بَخِيلٌ))^(۳)

”نہیں داخل ہوگا جنت میں دھوکا دینے والا، احسان جتانے والا اور کنجوس۔“

ان نصوصِ قرآن اور احادیثِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ اللہ کے نزدیک بخل یا کنجوسی انتہائی مذموم شے ہے یہاں تک کہ بتا دیا گیا کہ کنجوس انسان جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ یقیناً یہ ایسی برائی ہے جس سے مکمل نجات حاصل کرنے کی کوشش کرنی ہے اور اپنا تزکیہ کرنا ہے۔

(۱) جامع الترمذی، کتاب البر والصلۃ، باب ماجاء فی السخاء

(۲) مسند احمد، مسند المکثرین، مسند ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ

(۳) جامع الترمذی، کتاب البر والصلۃ، باب ماجاء فی البخیل...

جو انسان شریعت کے مطابق بخیل قرار پا جائے اس کے بارے میں تو یہ احادیث اور آیات ہم نے پڑھ لیں کہ وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا لیکن یہ بخل کا انتہائی درجہ ہے جب کہ اس سے کمتر درجے میں بھی بخل کیا جاسکتا ہے۔ ہو سکتا ہے ایسے بخل کے نتیجے میں ہم جہنم میں تو نہ جائیں لیکن کچھ نہ کچھ ضرر بہر حال پہنچے گا، مثلاً بخیل شخص کے باہمی تعلقات خوش گوار نہیں رہ پائیں گے۔ اُس کی شخصیت مسخ ہو جائے گی، احسان کا درجہ حاصل نہیں ہو پائے گا۔ اور اگر بخل سے نجات پالی جائے تو دنیا کے فائدے بھی ملیں گے اور آخرت میں بھی بچا لیے جائیں گے۔

بخل کا دائرہ:

اب ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ بخیلی کس کس طرح کی ہو سکتی ہے۔ بخل کی کچھ صورتیں تو واضح گناہ میں شامل ہیں یعنی ایسا بخل جسے شریعت بخل کہہ دے تو وہ باعثِ وبال ہے۔ چنانچہ یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ بخل کیا ہوتا ہے جس پر جہنم کی وعید آئی ہے۔ مثال کے طور پر اللہ نے کسی کو مال سے نوازا اور وہ اس کی زکوٰۃ ادا نہ کرے یا کم ادا کرے یہ شریعت کی نظر میں بخل ہے۔ بخل کی یہ صورت ہے ہی پیسے والوں سے متعلق۔ مال دینے سے ہاتھ روکنا دراصل مالداروں کا مرض ہے۔

مال میں بخل:

جن کے پاس مال کی کثرت ہوتی ہے اُن کو بخل لاحق ہو سکتا ہے یعنی اللہ نے بہت کچھ دے رکھا ہے مگر اُس کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، مٹھی بند رکھتے ہیں۔ زمینیں ہیں، فیکٹریاں ہیں، تجارت و کاروبار ہے، دھن دولت برس رہی ہے مگر زکوٰۃ نہیں نکالتے، اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، ضرورت مندوں کو نہیں دیتے، صدقہ خیرات نہیں کرتے۔ اسی کے بارے میں سورہ آل عمران میں ارشاد ہوا کہ یہ تمام مال و اسبابِ آخرت میں طوق بنا کر گلے میں ڈالا جائے گا یا پھر سانپ بن کر ڈسے گا۔ اور حدیث شریف میں بیان ہوا:

((مَنْ آتَاهُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ مَالًا فَلَمْ يُؤَدِّ زَكَاتَهُ مُقِلَّ لَهُ مَالُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شُجَاعًا أَفْرَعًا لَهُ

زَبَيْبَتَانِ يَأْخُذُ بِلَهْزِمَتَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيَقُولُ أَنَا مَالِكٌ أَنَا كَنْزُكَ))^(۱)

”جو شخص اپنی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا اس کا سارا مال قیامت کے روز اس کے گلے میں سانپ بنا کر

ڈالا جائے گا۔ جو اُس کی بانچھوں کو ڈسے گا اور کہے گا میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں۔“

اور اگر نصاب کے مطابق زکوٰۃ ادا کر دی گئی ہے اور شریعت کے عائد کردہ حقوق بھی ادا

(۱) سنن النسائی، کتاب الزکاة، باب مانع الزکاة مالہ

کردیئے ہیں اور پورے پورے ادا کیے ہیں، یعنی صدقات اور خیرات وغیرہ، تو سارا مال حلال ہے اور اس کے تصرف کی اجازت ہے۔

کفالت میں بخل:

دوسری چیز یہ کہ اگر آدمی اپنے زیر کفالت افراد پر خرچ نہ کرے تو یہ بخل ہے۔ بیوی بچوں پر، ماں باپ پر، بہن بھائیوں پر، قرابت داروں پر۔ خرچ کرنے کی استطاعت کے باوجود ان پر خرچ نہیں کرتا یا اگر کرتا بھی ہے تو اپنی حیثیت سے بہت کم خرچ کرتا ہے، یہ دونوں صورتیں بخل میں شمار ہوتی ہیں۔ خاص طور پر بیٹے پر لازم ہے کہ والدین کی ضروریات کا خاص خیال رکھے، اُن پر کھلے دل سے خرچ کرے، کیوں کہ اگر کوئی بیٹا اپنے والدین پر خرچ نہیں کرتا لیکن ساری دنیا کے رفاہِ علمہ کے اداروں (philanthropist organizations) کو پیسہ دیتا ہے تو پھر بھی وہ بخیل ہے۔ اسی طرح کوئی شخص بیوی کو نان نفقہ نہیں دیتا، کنجوسی کرتا ہے، ہاتھ کھینچ کر رکھتا ہے یا علاج معالجے پر خرچ نہیں کرتا، یا اولاد کی تعلیم پر خرچ نہیں کرتا لیکن دنیا کے دکھانے کے لیے غریبوں میں آٹے کی بوریاں بانٹتا ہے تو پھر بھی وہ بخیل ہے۔ یہ سب باتیں بخل کی نشانیاں ہیں اور گناہ میں شمار ہوتی ہیں۔

عبادات میں بخل:

عبادات میں بخل کا مطلب یہ ہے کہ ہم عبادات نہ کریں اور اگر کریں بھی تو پوری طرح سے نہ کریں۔ مثلاً نماز نہ پڑھیں یا کم پڑھیں، استطاعت ہونے کے باوجود حج نہ کریں۔ پیسہ ہے، صحت ہے، جا بھی سکتے ہیں لیکن پھر بھی حج سے غافل ہیں، یہ بھی بخل ہے۔ صاحب ثروت ہونے کے باوجود اللہ کی نعمتوں کو اُس کی راہ میں نہ لگانا، سب بچا بچا کر اپنے لیے رکھ لینا بھی بخل ہے، جس کا ذکر سورہ محمد ﷺ کی آیت ۳۸ میں ہے:

{ هَا أَنْتُمْ هَؤُلَاءِ تَدْعُونَ لِنُفُوقِ سَبِيلِ اللَّهِ فَمِنْكُمْ مَنْ يَبْخُلُ }

”تم وہی ہو کہ جب پکارا جاتا ہے کہ آؤ اللہ کی راہ میں خرچ کرو تو تم میں سے ایسا بھی ہے کہ بخل کرتا ہے۔“

تو اس طرح جو شریعت کے مطابق بخل کرے گا اس کے لیے سخت وعید آئی ہے۔

اب آگے ہم بخل کی دیگر صورتیں دیکھیں گے جن کے ارتکاب سے ضروری نہیں کہ انسان جہنم

واصل ہو جائے لیکن اگر وہ ان چیزوں میں بخل کرے گا تو پھر وہ درجہ احسان نہیں پاسکے گا، اس کی

شخصیت نکھر نہیں سکے گی۔ دراصل بخل کا کسی بھی صورت میں ہونا شخصیت پر منفی (negative) اثر چھوڑتا ہے، شخصیت جامع اور خوبصورت نہیں بن پاتی۔ لہذا ہمیں بخل کی ہر صورت سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرنی ہے۔

مروت میں بخل:

مروت کے لیے انگریزی میں (chivalry) کا لفظ شاید استعمال ہو سکتا ہے۔ اردو میں مروت کے معنی رواداری کے ہوتے ہیں یا کسی کا لحاظ رکھنا۔ مروت کے مادے سے ہی لفظ ”افموی“، (مرد) اور ”افمویۃ“ (عورت) ہیں۔ قرآن میں بھی اس مادے سے یہ الفاظ آتے ہیں۔ یہ مروت انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ لاطینی (Latin) زبان میں (vir) کا مطلب ہوتا ہے مرد، (virility) مردانگی۔ انگریزی میں انسان کا نیک سیرت (virtuous nature) ہونا بھی اسی مادے (root) سے ہے یعنی یہ انسانیت کا تقاضا ہے کہ آدمی مروت سے کام لے، دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔

مروت میں بخل کیا ہوتا ہے؟ وہ یہ کہ گنجائش ہوتے ہوئے بھی لوگوں کے ساتھ تنگی کرے۔ مثال کے طور پر کسی کو قرض دیا لیکن مقرض مقررہ وقت پر پیسے واپس نہیں کر پارا اور قرض دینے والا مہلت دے سکتا ہے اور اس کو کوئی فوری (immediate) ضرورت بھی نہیں ہے یا کچھ دن مزید صبر کر سکتا ہے مگر پھر بھی سختی کرتا ہے تو یہ مروت میں بخل ہے۔ ایسے موقع پر بندہ مومن کو رواداری کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا، یہ مروت کا تقاضا ہے اور ایسا نہ کرنا مروت میں بخل شمار ہوگا۔ حدیث میں ایک واقعہ نقل ہوا ہے۔ ایک مال دار آدمی تھا جو لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا اور اُس نے اپنے کارندے سے کہہ رکھا تھا کہ اگر مقرض کے پاس ادا کرنے کو کچھ نہ ہو تو اس کو مہلت دے دینا۔ جب یہ شخص مرا تو اللہ تعالیٰ نے اس بات پر اس کو معاف فرما دیا اور جہنم سے آزاد کر دیا۔ اس واقعہ سے کیا سبق ملا کہ اپنا حق وصول کرنے میں بندہ سختی نہ کرے اور دوسروں کا حق دینے میں محتاط رہے، وقت پر ادا کرے بلکہ حق واجب ہونے پر حق سے زیادہ ہی دے اور اپنا حق لینے میں ذرا مروت سے کام لے۔ اگر دیکھا جائے تو یہ شریعت کے لحاظ سے بھی بخل ہے کہ دوسروں کا حق مار لیا جائے اور اپنے حق کی وصولی میں سختی کی جائے۔

اپنے ملازمین کے ساتھ بھی مروت کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ اُن کی معمولی کوتاہیوں کی وجہ سے

تنخواہ کاٹنا، بروقت پیسے نہ دینا یا کم تنخواہ ملنے کا صحیح طرز عمل نہیں ہے۔ غریب آدمی جس کے زیر کفالت کئی افراد ہوں اس کے لیے ایک دن بھی تنخواہ دیر سے ملنا پریشانی کا سبب بن سکتا ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں نوکروں سے زیادتی قابل تحسین سمجھی جاتی ہے، بڑی خوبی سمجھی جاتی ہے، باقاعدہ فخر سے بتایا جاتا ہے کہ ہمارا نوکر تو صفائی بھی کرتا ہے، کھانا بھی پکاتا ہے، رات کو چوکیداری بھی کرتا ہے، وقت پڑنے پر گاڑی بھی چلا لیتا ہے، سودا سلف بھی لا کر دے دیتا ہے اور میں صرف تین ہزار روپے تنخواہ دیتی ہوں۔ اور لوگ جواباً کہتے ہیں آپ کتنے خوش قسمت ہیں (how lucky! you are!) ہمارا ملازم تو صرف کچن سنبھالتا ہے اور پانچ ہزار روپے لیتا ہے۔ پھر کوئی کہتا ہے لو بیوقوف ہو، ریٹ (rate) خراب کرتے ہو۔ اور بہت داد دی جاتی ہے، عقلمند سمجھا جاتا ہے اُن کو جو اس طرح نوکروں سے بہت سارا کام لے سکیں اور حقیر سی تنخواہ دیں۔ اس کو کہتے ہیں کتنا کفایت شعار ہے، اور اُس کے بخل کو سراہتے (appreciate) ہیں۔ اگر کوئی شخص دس بارہ گھنٹے کام کرتا ہے تو اُس کو اس کی محنت اور وقت کے مطابق اجرت دینی چاہیے۔ یہ امر باعث شرمندگی ہے کہ ہم اپنے ماتحت سے زیادہ کام لیں اور معاوضہ تھوڑا دیں۔ اس پر فخر کرنا، ایسی حرکت کو تمغہ عزت (badge of honour) سمجھنا اور عقلمندی کی دلیل سمجھنا یقیناً غلط روش ہے اور یہ بخل بھی ہے۔ جتنا کام لیں اتنا معاوضہ ادا کریں، ریٹ خراب ہونے کی فکر نہ کریں، اللہ نے دیا ہے تو اللہ ہی کا کچھ کر خرچ بھی کریں۔

بعض لوگ اتوار بازار جا کر سینکڑوں بلکہ ہزاروں روپے کی خریداری کرتے ہیں اور وہاں مزدوروں سے ٹوکریاں اور سامان اٹھواتے ہیں جو وزن اٹھا کر اُن کے پیچھے پیچھے گھومتا رہتا ہے، گھنٹوں آپ کے ساتھ رہتا ہے۔ آخر میں اُسے پانچ یا دس روپے پکڑا دیتے ہیں۔ یہ سراسر بخل ہے جہاں آپ نے دو تین ہزار کی شاپنگ کی اور بیچارے مزدور کا ایک گھنٹہ بھی لے لیا تو پچاس سو روپے دینے میں کیا حرج ہے، نیکی بھی ملے گی، وہ دعا بھی دے گا اور اللہ بھی راضی ہوگا۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس بخل پر ہم کفایت شعاری کا لیبل لگا دیتے ہیں اور ساری بچت ہم ایک غریب کو پورا معاوضہ نہ دے کر کرتے ہیں۔

آپ یہاں کے ریٹ (rate) خراب ہونے کی فکر مت کریں۔ اپنے اس نامہ اعمال کی فکر کریں جو مسلسل سیاہ ہو رہا ہے اور قیمت میں جس کا سامنا ہوگا۔ اور اگر اُس میں نیکیاں ملکی ہو گئیں تو

سوچیں کتنا بڑا نقصان ہو جائے گا۔ دنیا میں تھوڑا سا زیادہ دے کر آپ کو اتنا نقصان نہیں ہوگا۔ یہ بھی سوچیں کہ آپ کپڑوں پر جوتوں پر فاسٹ فوڈ اور بچوں کے کھلونوں پر بے تماشاً خرچ کر ڈالتے ہیں لیکن کسی غریب کو دینے میں ساری کفایت شعاری یاد آجاتی ہے۔ یقین رکھیں آپ کے مال میں سو دو سو روپے خرچ کرنے سے کوئی کمی نہیں ہوگی۔ کسی مزدور کو دس، بیس روپے زیادہ دے کر آج تک کوئی غریب نہیں ہوا۔

بعض لوگوں کی ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ زکوٰۃ نکالتے نہیں گھبراتے، صدقہ خیرات کرنے سے نہیں گھبراتے، لیکن تنخواہیں دیتے ہوئے جان جاتی ہے۔ اگر ملازموں کی معاشی ذمہ داریاں زیادہ ہیں مثلاً بوڑھے والدین ہیں، بیوی بچے ہیں، ایک ہی کمانے والا ہے تو اس کو فرسخ دلی سے تنخواہ دیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ تنخواہ تو ہم اتنی ہی دیں گے اس کے علاوہ مدد وغیرہ کرتے رہیں گے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس طرح ملازمین کی عزت نفس بار بار مجروح ہوتی ہے، جب وہ آپ کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں، سوال کرتے ہیں اور آپ اُن کو خیرات دیتے ہیں۔ اس کے بجائے تنخواہ اتنی دیں کہ ان کی ضروریات پوری ہو جائیں اور اُن کی عزت نفس (self respect) بھی سلامت رہے، اُس پر زدن نہ پڑے۔ کیوں کہ ہم تنخواہ اپنا حق سمجھ کر لیتے ہیں، ہماری محنت کی کمائی ہوتی ہے۔ بجائے اس کے کہ آپ چار ہزار تنخواہ مقرر کریں اور پھر دو ہزار خیرات دیں، اس کی تنخواہ چھ ہزار روپے مقرر کر دیں۔ پھر اگر اس کو ضرورت پڑے تو آپ اپنی حیثیت کے مطابق نیک سلوک کرتے رہیں۔ لیکن تنخواہ دینے میں بخل مت کریں۔

بخل عموماً پیسے والوں (haves) کا مرض ہے۔ اللہ نے حیثیت دی ہے، اچھا کھاتے پیتے ہیں، فانیو اسٹار ہوٹل جا کر دس بارہ ہزار کا کھانا کھا لیتے ہیں، ہزار دو ہزار کا پیزا (Pizza) آرڈر کر کے گھر پر منگوا لیتے ہیں تو پھر نو کروں کے ساتھ بھی بخل مت کیجیے، اس سے اُن کے اندر غصہ پیدا ہوتا ہے۔ بخل دوسروں میں نفرت (resentment) پیدا کرتا ہے۔

بخل نفرت کا سبب:

اسلام کا اولین دور دیکھیں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں مال دار صحابی بھی تھے لیکن جو غریب تھے ان کو کبھی مال داروں سے نفرت نہ ہوئی۔ کبھی آپ یہ نہیں پڑھیں گے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کبھی نفرت کا اظہار کیا یا حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ جو کہ لکھ پتی صحابی تھے، اُن کے خلاف حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ نے کبھی نفرت کا اظہار کیا۔ اُس معاشرے میں بہت امیر بھی

تھے اور بہت غریب بھی، لیکن غریب امیروں سے نفرت نہیں کرتے تھے اور نہ حرص کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امیر بخل نہیں تھے اور غریب حریص نہیں تھے۔ امیر سخی تھے وہ دوسروں پر خرچ کیا کرتے تھے، غریبوں کو مانگنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی مانگنے سے پہلے ہی اُن کو مل جاتا تھا۔ امیر ضرورت مندوں کا خیال رکھتے، باخبر رہتے اور ضروریات پوری کرتے رہتے تھے۔ ہمارا بھی یہی رویہ ہونا چاہیے، ہمیں دوسروں کی ضروریات اور حاجات کا اندازہ ہونا چاہیے۔ ہمیں بھی سخی ہونے کی ضرورت ہے۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں میں ڈنڈی مار کر اس کو کفایت شعاری کا لیبل (label) نہ دیا کریں، یہ کفایت شعاری نہیں بلکہ بخل ہے۔ کفایت شعاری کو ہم ان شاء اللہ تعالیٰ آگے زیر بحث لائیں گے۔

مروت میں بخل کی ایک اور مثال:

مروت میں بخل کی ایک اور مثال یہ ہے کہ کوئی بہن بازار جائے اور چھوٹی چھوٹی چیزوں میں دام کم کرانے کے لیے جت بازی کرنا شروع کر دے۔ اب ایک کیلے والا ٹھیلہ لگا کر کھڑا ہے اور آپ کو پتہ ہے کہ اگر شام تک اس کا مال نہ بکا تو خراب ہو جائے گا۔ لہذا شام کو نقصان سے بچنے کے لیے مجبوراً وہ قیمت کم لگاتا ہے لیکن آپ اُس کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مزید قیمت کم کرنے کے لیے تکرار کرتی رہتی ہیں، تو یہ غلط ہے۔ وہ بیچارہ دے تو دیتا ہے لیکن آپ یہ سوچیں کہ دس روپے کم کروا کر ہم نے کتنا بچا لیا؟ اگر ہم اُسی قیمت میں لے لیتے تو غریب کا بھلا ہو جاتا۔ اپنے بچوں کو تو آئس کریم (ice cream) کھانے کے لیے سو روپے بغیر سوچے سمجھے دے دیتے ہیں تو ٹھیلے والے سے دس بیس روپے بچا کر ہم نے کون سا کمال کر دیا۔ بازار میں آلو پیاز پر کچھ پیسے کم کرانا مروت کا بخل ہے، وقت بھی ضائع ہوتا ہے اور غریب کو تھوڑے منافع سے محروم کر کے خود بھی کچھ نہیں حاصل ہوتا۔

بازار میں اس بھاؤ تاؤ کے چکر میں بہت وقت ضائع ہو جاتا ہے اور کتنا کچھ بچا پاتے ہیں؟ کچھ بھی نہیں! ہاں اگر ہزاروں کی چیز خریدتے وقت پانچ سو یا ہزار کم کروا لیے تو بات بھی ہے، یہ بخل نہ ہوگا، البتہ معمولی چیزوں میں، معمولی رقم پر بھاؤ تاؤ کرنا بخل ہے۔

اس کے برخلاف ایک روپیہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک بازار میں کیلے کے کئی ٹھیلے لگے ہیں۔ کوئی بیس روپے درجن دے رہا ہے، کوئی پچیس روپے اور کوئی تیس روپے درجن، لیکن کوئی سب کی ایک

جیسی ہے۔ اب آپ نے بخل سے بچنے کے لیے تیس روپے درجن والے خرید لیے کیوں کہ سستا خریدنے میں بخل کا احتمال ہے۔ یہ دراصل حماقت کا ارتکاب ہے۔ ایسا بھی نہ کریں کہ سخاوت اور فیاضی کے نام پر پوری تنخواہ بانٹ کر اڑادیں، سستی چیزیں چھوڑ کر وہی چیزیں منگئے داموں میں خرید لیں۔ حماقت کرنے کو نہیں کہا جا رہا سخاوت کرنے کو کہا جا رہا ہے۔ سخاوت اور حماقت میں فرق ہے۔ پودینے اور ہرے دھنیے اور مرچوں کی گندیوں پر دو تین روپے بچا کر کون سی جائیداد بنا لیں گے۔

تحفہ دینے میں بھی خیال رکھیں کہ وہ چیز نہ زیادہ گھٹیا ہو اور نہ بہت قیمتی۔ اس میں فضول خرچ (over board) ہونے کی ضرورت نہیں کہ قرضے لے کر یا حیثیت سے بڑھ چڑھ کر، یا دکھاوے اور واہ واہ کے لیے قیمتی تحفے دیں۔ بس مناسب چیز ہو، حیثیت کے مطابق۔ لیکن حیثیت کے باوجود گھٹیا چیز تحفے میں دینا مروت کا بخل شمار ہوگا۔

صدقہ میں بخل:

صدقہ خیرات کرتے وقت گھٹیا ترین چیز دینا کھلا بخل ہے۔ سورۃ البقرہ آیت نمبر ۲۶۷ میں

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

{ وَلَا تَسِيْمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ بِأَخِيذِهِ إِلَّا أَنْ تُخْضُوا فِيهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ

اللَّهُ غَنِيٌّ حَمِيدٌ }

”اور بڑی اور ناپاک چیزیں دینے کا قصد نہ کرنا جس کو تم خود لینے والے نہ ہو مگر اس طرح کہ تم

کو آنکھیں بند کرنی پڑیں، جان لو کہ اللہ غنی ہے اور حمید ہے۔“

صدقہ و خیرات میں بخل کیسے کیا جاتا ہے؟ پہلی بات تو یہ کہ جو چیزیں ہم خیرات کے لیے نکالتے ہیں وہ ہوتی ہی پرانی ہیں، رنگ اتر چکا ہوتا ہے، گھس چکی ہوتی ہیں، اس پر مستزاد یہ کہ دیتے ہوئے خیال آتا ہے کہ دوپٹہ تو اتنا استعمال نہیں ہوا، یہ رکھ لیتے ہیں۔ یہ نیل (lace) جو گلے، دامن اور آستینوں میں لگی ہوئی ہے یہ اتار لیتے ہیں، کام آجائے گی۔ باقی سوٹ صدقہ کر دیتے ہیں۔ اور ایسا جوڑا صدقہ دے کر اپنے آپ کو نیک سمجھتے ہیں اور سخاوت کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ یہ دراصل خیرات میں بخل ہے۔ ذرا یہ سوچیں کہ اللہ جب آپ کو ان نعمتوں سے نوازتا ہے تو کس طرح دیتا ہے؟ کیا پھٹا پرانا، گھسا پٹا، ادھڑا ہوا؟ صدقہ کرتے وقت یہ بہت سخت آزمائش ہوتی ہے۔ اچھی چیز تو دینے کو بالکل دل نہیں چاہتا، لیکن نفس کے ساتھ جہاد کریں اور اس خواہش کو ضبط (control)

کریں۔ یہی اللہ فرماتا ہے کہ ایسی چیز مت دو کہ اگر تم کو دی جائے تو تم قبول نہ کرو۔ نوکروں پر کھانے پینے کے معاملے میں بہت زیادہ سختی نہ رکھیں۔ اگر کبھی بغیر پوچھے کچھ اٹھا کر کھالیا یا پی لیا تو نظر انداز کر دیں۔ کھانے پینے کی چیزوں کو تالوں میں نہ رکھیں اور نہ فرج میں تالہ لگائیں بلکہ فروٹ وغیرہ میں اُن کا حصہ ضرور نکالیں، گن گن کر نہ دیں۔ اللہ تو آپ کو بے شمار اور اُن گنت دیتا ہے، مزید یہ کہ پھل دینے میں یہ نہ کریں کہ گلے سڑے پھل نوکروں کو دے دیئے یا گوشت میں گردن اور ہڈی پر تھوڑے سے گوشت والی بوٹی ان کی پلیٹ میں ڈال دی۔ خدا کا خوف کریں، چاہے تھوڑی چیز دیں مگر اچھی دیں۔ اس کے علاوہ نوکروں کے برتن الگ نہ رکھیں بلکہ اپنے ہی گلاس اور پلیٹ میں اُن کو کھلائیں۔ یہ بھی بخل ہے کہ اپنے سے نیچے والوں کو کمتر سمجھا جائے، فرق کیا جائے۔ صرف باسی کھانے پر ہی اُن کو نہ ٹر خا دیا کریں۔ تازہ اور باسی دونوں کھانے آپ بھی کھائیں اور اُن کو بھی دیں۔ اس طرح اُن کی عزت نفس (self respect) مجروح نہیں ہوگی، عزت نفس کو نہیں نہیں لگے گی۔ بخیل شخص یہ چاہتا ہے کہ صرف باسی کھانا نہیں دے اور خود تازہ کھانا کھائے۔

مروت میں بخل یہ بھی ہے کہ نوکر صوفے پر ہمارے برابر نہیں بیٹھ سکتے بلکہ ان کے بیٹھنے کی جگہ تو زمین ہی ہے۔ اگر وہ کہیں ہمت کر کے صوفے پر بیٹھ جائیں تو ہم کیا سوچتے ہیں! ان کا دماغ خراب ہو گیا ہے اپنے آپ کو صاحب کے برابر سمجھتا ہے، ادب و لحاظ چھو کر نہیں گزرا۔ جب تک چار پائیوں کا رواج تھا، برابری تھی۔ لوگ ساتھ آکر بیٹھ جایا کرتے یا دوسری چار پائی پر سامنے آکر بیٹھ جاتے۔ اور گاؤں دیہاتوں میں اب بھی چار پائی کے رواج کی وجہ سے برابری ہے، مگر جب شہروں میں ڈرائینگ روم سجالیے گئے، صوفے اور کرسیاں استعمال میں آگئیں تو طبقاتی فرق بہت بڑھ گیا۔

دوسرے ملکوں میں صفائی کرنے والیوں (cleaning ladies) کے ساتھ بڑی تمیز سے بات کرتے ہیں۔ پلیز کہہ کر کام کرواتے ہیں۔ اُن کو الگ پلیٹوں میں کھانا ڈال کر نہیں دیا جاتا بلکہ آزادی سے فرج کھول کر کھانے پینے کی چیزیں استعمال کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ گھر کے عام برتن استعمال کرتے ہیں، کسی کو اعتراض نہیں ہوتا۔ یہ اخلاق و آداب اور یہ رویہ تو مسلمانوں کے معاشرے میں ہونا چاہیے تھا۔ ان چیزوں کا خیال رکھنا چاہیے، یہ طبقاتی فرق ٹھیکہ مشرکانہ مزاج ہے۔ انسانوں کے کسی گروہ کو اچھوت (untouchable) سمجھنا مشرکانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے۔

اسلام میں سب برابر ہیں۔ مسجد میں نماز کے دوران سب برابر ہوتے ہیں یا نہیں! کیا حج پر پتہ چلتا ہے کون امیر ہے کون غریب؟ سب ایک ہی لباس پہنے ہوئے ہوتے ہیں اور جس کو جہاں جگہ مل جائے وہیں بیٹھ جاتا ہے۔ آپ خود سوچیں کہ گھر کی ساری صفائیاں وہ کریں، ہماری گندگی وہ صاف کریں اور ہم ان کو گندا تصور کریں؟ یہ تفریق اور نفرت مشرکوں میں ہوتی ہے، اُن کے اندر مروت نہیں ہوتی۔ اسلام ہمیں بہت زیادہ مروت سکھاتا ہے اور دوسروں کی عزت نفس کی قدر سکھاتا ہے۔ لہذا اُن کو عزت دیں، اپنے بچوں سے بھی ان کی عزت کروائیں، اور اس معاملے میں بخل نہ کریں۔ سخی ہونا، کریم ہونا، بڑی خوبیوں میں سے ہے۔ نبی اکرم ﷺ سب سے زیادہ کریم تھے، آپ ﷺ کسی چیز میں بخل نہیں کیا کرتے تھے۔ غریبوں کے ساتھ اس طرح عزت اور مروت سے پیش آنے سے غریبوں کے دل جیتے جاسکتے ہیں۔ پھر وہ ہماری بڑی محبت اور عزت کرنے لگتے ہیں اور دیگر امیروں سے نفرت نہیں کرتے، انہیں پیسے والوں کو دیکھ کر غصہ نہیں آتا۔

برتنوں کے معاملے میں بھی ان کے ساتھ بخل ہوتا ہے۔ گھر والوں کے لیے کانچ کے گلاس اور پلیٹیں اور نوکروں کے لیے اسٹیل یا پلاسٹک کے گلاس اور پلیٹ مختص ہوتے ہیں۔ البتہ اگر خود آپ بھی اسٹیل کے برتن استعمال کریں تو ٹھیک ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ یہ احتیاطیں ہم صفائی (hygiene) کے نام پر کرتے ہیں۔ کہتے ہیں اُن کو دانتوں اور مسوڑوں کی بیماری ہوتی ہے، ہاتھ گندے رہتے ہیں، کوئی لگنے والی بیماری ہوگی، جراثیم پھیلتے ہیں وغیرہ وغیرہ، اسی لیے ہم ان کے برتن علیحدہ رکھتے ہیں۔ یہ بتائیں کہ جب ہمارے ہاں کوئی مہمان آتے ہیں تو کیا ہم اُن سے پہلے صحت اور صفائی کا پوچھتے ہیں یا انہیں فوراً شربت (drinks) وغیرہ پیش کرتے ہیں۔ مروت صرف پیسے والوں کے ساتھ نہیں برتنی چاہیے بلکہ تمام انسانوں (human dignity) کے ساتھ برتنی چاہیے۔ یہ اسلام کے بنیادی اخلاقیات ہیں۔ کام کرنے والوں کی عزت (of dignity labour) کریں۔ وہ اپنے ہاتھ سے حلال کما کر کھاتے ہیں جو انسانیت کی معراج ہے۔ محنت کی کمائی کھاتے ہیں، صرف یہی قابل عزت بات ہے۔ جتنے دوسروں کی عزت میں سخی ہوں گے ان شاء اللہ اتنی ہی اللہ کی رحمت بر سے گی۔

بخیل کی بد نصیبی:

بخیل انسان کا مرض یہ ہوتا ہے کہ خرچ کرتے وقت اس کا دل گھٹٹا ہے، دکھتا ہے، اُسے

تکلیف ہوتی ہے۔ خرچ کرنے کے بعد پچھتا تا ہے اور غمگین رہتا ہے۔ اللہ کی نعمتوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ”بخیل بہت بد نصیب ہوتا ہے دنیا میں محروم اور آخرت میں معدب (عذاب دیا جانے والا)۔“ بخیل کی زندگی بخیل پر پڑتی ہے وہ خود سب سے زیادہ تکلیف (suffer) محسوس کرتا ہے۔

لباس میں بخیل:

لباس میں بخیل یہ ہے کہ اچھا خاصا پیسہ ہونے کے باوجود اس قدر بُرا اور گھٹیا لباس پہننا جائے کہ لوگ خیرات دینے آجائیں۔ ایک بزرگ تھے جن کا طریقہ یہ تھا کہ جائے نماز کے نیچے کچھ پیسے رکھا کرتے تھے، جو کوئی محتاج یا ضرورت مند سا نظر آتا اُس کو پیسے نکال کر دے دیتے۔ ایک صاحب ملنے کے لیے آئے تھوڑے بے حال سے تھے، پچھے پرانے، میلے کھیلے کپڑے پہنے ہوئے تھے تو بزرگ نے جائے نماز کے نیچے سے کچھ پیسے نکالے اور اُس شخص کو دینے چاہے، تو اُس نے بتایا حضرت میں باحیثیت انسان ہوں تو بزرگ ناراض ہوئے کہ تم باحیثیت اور باعزت ہو تو فقیروں جیسا حلیہ کیوں بنایا ہوا ہے۔ اللہ کی نعمتوں کی ناشکری اور ناقدری کیوں کر رہے ہو، اپنی حیثیت کے مطابق لباس پہننا کرو۔ لہذا یہ بھی بخیل میں آتا ہے کہ انسان فقیرانہ بود و باش اختیار کر لے۔

سلام میں بخیل:

سلام میں مروت کا تقاضا کیا ہے؟ کوئی آپ کو سلام کرے تو جواب میں خوش مزاجی کے ساتھ، مسکرا کر، خندہ پیشانی سے، اس سے بہتر الفاظ میں جواب دیں۔ وہ کہے السلام علیکم! تو آپ جو باورِ رحمۃ اللہ و برکات کا اضافہ کریں۔ یہ سخاوت ہے۔ سلام میں بخیل کیا ہوگا کہ بددلی سے جواب دیا یا پھر ولیکم کہہ کر چپ ہو گئے یا صرف گردن یا ہاتھ ہلا کر جواب دینے پر اکتفا کر لیا، بڑی شان بے نیازی کے ساتھ جواب دیا۔ یا پھر سلام کرنے والے کی حیثیت کے مطابق سلام کا جواب دیا۔ اپنے سے اونچے یا برابر کے طبقے والوں کو پُر جوش سلام کا جواب دیا لیکن غریب لوگوں کو، ملازمین کو، نوکروں کے سلام کو ٹال دیا یا سلام کرنے میں پہل نہ کی۔ غرباء اپنی غربت کے باوجود سخی ہوتے ہیں، سخاوت کرتے ہیں، سلام کرنے میں پہل کرتے ہیں اور آپ امیر ہوتے ہوئے بھی سلام میں بخیل کرتے ہیں، یہ توقع رکھتے ہیں کہ پہل وہ کریں اور آپ صرف سر ہلا کر جواب دے دیں۔ یہ غلط بات ہے، کوشش کریں کہ گھر میں کام کرنے والوں کو خود آگے بڑھ کر سلام کریں اور بچوں کی تربیت

کریں کہ وہ اُن کو آپ کہہ کر مخاطب کریں اور سلام کریں۔

بچوں کو بخیل سے بچائیں:

جو لوگ خود بخیل ہوتے ہیں وہ اپنے بچوں کو بھی یہی اقدار سکھاتے ہیں اور بچے اُن کے کردار کو دیکھ دیکھ کر بھی سیکھتے ہیں۔ بچوں کو کھلونے، اسکول میں دوستوں کے ساتھ لنچ (lunch) بانٹنا، (share) کرنا سکھائیں۔ بچوں کو اسکول میں اپنا کھانا یا دوسری چیزیں دوسروں کو دینے سے مت روکیں۔ بچوں کو ایک دوسرے کی بوقت ضرورت مدد کرنا سکھائیں اور چیزیں بانٹنے کی ترغیب دیں کیوں کہ اس میں برکت ہے اور اجر ہے۔ ساتھ ساتھ اپنی چیزوں کی حفاظت اور ان کو دھیان سے رکھنا بھی سکھائیں، ادھر ادھر ضائع کرتے نہ پھریں۔ ان دونوں انتہاؤں (extremes) میں تیز کرنا سکھائیں۔ چیزوں کو سنبھال کر رکھنا اور بخل کرنا دو الگ الگ رویے ہیں۔

مہمانوں کے ساتھ بخل:

مہمانوں کے ساتھ بھی بخل کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً گھر میں اچھی چیز موجود ہو لیکن آپ کسی عام سی چیز سے مہمان کی تواضع کریں، یہ بھی دراصل مروت کا بخل ہے، مہمان کا احترام کرنا ضروری ہے۔ گھر میں موجود اچھی چیز مہمان کے آگے رکھیں۔ یہ حدیث ہے کہ مہمان برکت لے کر آتے ہیں۔ ایک کا کھانا دو کو اور دو کا کھانا چار کو پورا ہوتا ہے۔ یہ آزمائی ہوئی چیز ہے کہ اگر لوگ مہمانوں کو اُن کا حق دیں تو اللہ اُن کے مال میں برکت عطا فرمادیتا ہے۔

خیرات میں بھی اچھی چیز دیا کریں۔ بہت گئی گزری چیزوں کا صدقہ خیرات نہ کریں۔ کیوں کہ یہ ہم اللہ کے نام پر دیتے ہیں، اُسی کا دیا ہوا ہے تو اُس کو اچھی چیز واپس کریں۔ بہت پرانے، گئے گزرے، کپڑے صفائی ستھرائی (dusting) کے لیے رکھ لیا کریں۔ ہمیں خیرات کرتے وقت اللہ کے اعلیٰ و ارفع و اولیٰ ہونے کا احساس ہونا چاہیے، وہ رزاق ہے، آسمانوں اور زمینوں کا مالک اور رب ہے، لہذا دیتے وقت روئے بھی اچھا رکھیں، مسکرا کر دیں، خندہ پیشانی سے دیں، جھک کر خیرات کریں، دوسروں کو یہ احساس نہ دلائیں کہ آپ کا اُن پر احسان ہے بلکہ اُن کا حق جان کر ادا کریں۔ تکبر کے ساتھ، بدولی کے ساتھ، ماتھے پر سلوٹیں ڈال کر دینا، شان بے نیازی سے دینا، یہ بھی اچھا نہیں ہے۔ اُس خیرات کا بھی اجر کم ہو جاتا ہے۔

بعض گھروں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ماں باپ اپنے بچوں کو اچھے اچھے کھلونے دلواتے ہیں اور کھلونوں کا ایک ڈھیر جمع ہو جاتا ہے مگر جب دوسرے گھروں کے بچے کبھی مہمان بن کر آجائیں تو فوراً تمام کھلونے چھپا دیئے جاتے ہیں، یہ بھی بخل ہے۔ اس دنیا کے خالق کے ارشاد کے مطابق دنیا بذاتِ خود ایک برتنے کی چیز ہے۔ اور اس دنیا میں بچوں کے کھلونوں کو اتنی اہمیت دینا کنجوسی کی انتہا ہے۔ ایسے لوگ دوسرے بچوں کو کھلونوں سے کھیلنے نہیں دیتے کہ خراب کر دیں گے۔ اپنے بچوں کو سکھاتے ہیں کہ اپنا کھلونا کسی کو مت دینا اور بچوں کو اس عمر سے بخیلی کی عادت ڈال دی جاتی ہے بعض بچے بڑے ہو جاتے ہیں اور بچپن کے کھلونے الماریوں میں سجائے ہوتے ہیں۔ اُن سے جدا ہونا مشکل لگتا ہے۔ ایسے لوگ پھر چھوٹے بڑے نقصان پر سخت مایوسی (depression) کا شکار ہو جاتے ہیں۔ نعت کے چمن جانے سے اُن کی جان پر بن آتی ہے۔

فالتو چیزوں میں بخل:

بعض گھروں میں خالی ڈبوں، خالی بوتلوں اور خالی شیشیوں کا انبار لگا ہوتا ہے، لیکن کسی کو دیتے نہیں ہیں کہ کام آئیں گی۔ آئس کریم کے خالی ڈبے اگر ماسی مانگ لے تو مشکل پڑ جاتی ہے اور اس کو کفایت شعاری سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ بخل اور کنجوسی ہے۔ کباڑ جمع کرنا، سمیٹ سمیٹ کر رکھنا کہ نہ جانے کب ضرورت پڑ جائے بخل ہے۔

جذبات میں بخل:

جذبات میں بھی بخل ہو سکتا ہے، مثلاً خوشی کے موقع پر خوشی کا اظہار نہ کرنا۔ اب کسی کے گھر میں شادی ہے یا نیا گھر بنا ہے یا بچہ امتحان میں کامیاب ہوا ہے یا کوئی اور مبارک موقع ہے لیکن دین کی رُو سے خوشی کا اظہار حرام سمجھ لیا کہ دنیاوی باتوں پر کیا خوش ہونا! یہ غلط ہے اور جذبات کا بخل ہے۔ اگر اس طرح کی خوشی میسر آئے تو ضرور منائیں اور اگر کسی کے ہاں ایسی خوشی آئے تو اُس کی خوشی میں ضرور شامل ہوں اور یوں دعا دین کہ اللہ مبارک کرے، اللہ مزید خوشیاں دکھائے۔ اسی طرح غم کا موقع ہو تو غم کا اظہار کریں۔ نبی اکرم ﷺ جب اپنے بیٹے کے انتقال پر ابدیدہ ہوئے، آپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے حیرت سے پوچھا: آپ ﷺ رورہے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ الْعَيْنَ تَدْمَعُ وَالْقَلْبَ يَحْزَنُ وَلَا نَقُولُ إِلَّا مَا يَزُحِيهِ رَبَّنَا وَإِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا

(۱) اِنْرَاهِم لَمَحْزُونُونَ

”دل میں نرمی تو ہے آنکھ تو غم کا اظہار کرے گی۔ مگر زبان سے کوئی شکایت کا لفظ نہیں نکلے گا۔“
چنانچہ اس میں بغل کا اظہار نہ کیا جائے۔

تعریف میں بغل:

کسی قابل تعریف چیز کی تعریف نہ کی جائے تو یہ بغل ہے۔ کسی نے کوئی اچھا کام کیا تو مدح کریں، اُس کی محنت کو سراہیں۔ لیکن تعریف کرنے میں جھوٹ نہ بولیں، مبالغہ آرائی سے کام نہ لیں۔ ہاں اگر تعریف کے قابل کوئی چیز ہے تو مناسب تعریف میں کوئی مضائقہ نہیں۔

مفتی تقی عثمانی صاحب اپنی کتاب ”اصلاحی خطبات“ میں اپنے استاد ڈاکٹر عبدالحی عیسیٰ سے ایک واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ایک صاحب اُن کے دروس میں آیا کرتے تھے ایک بار ڈاکٹر عبدالحی عیسیٰ کو کھانے پر بلایا۔ حضرت وہاں گئے، کھانا کھایا اور کھا کر بہت تعریف کی کہ بہت لذیذ پکا ہے۔ خاتون خانہ بھی پردے کے پیچھے موجود تھیں وہ کھانے کی تعریف سن کر رونے لگیں تو یہ بڑے حیران ہوئے۔ پوچھا، بہن میری کس بات سے آپ کو تکلیف پہنچی، میں نے تو کھانے کی تعریف کی ہے۔ کہنے لگیں کہ مجھے اپنے شوہر کے ساتھ رہتے ہوئے چالیس برس گزر گئے۔ آج تک اُن کے منہ سے میں نے یہ جملہ نہیں سنا کہ آج کھانا اچھا پکا ہے۔ آج آپ کے منہ سے سنا تو مجھ کو رونا آ گیا۔ لہذا کوئی تعریف کے قابل چیز ہو تو تعریف کریں۔ کوئی خوبصورت لگ رہا ہے یا کسی نے اچھا لباس پہنا ہے تو کہہ دیجیے کہ آپ اچھے لگ رہے ہیں یا لباس اچھا لگ رہا ہے۔ دین پر کاربند ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بندہ بالکل خشک مزاج ہو جائے، تلخ (bitter) اور بے حس ہو کر رہ جائے اس کی ضرورت نہیں۔ مبالغے سے یقیناً بچنا چاہیے لیکن بغل کرنا بھی ٹھیک نہیں، یہ دوسری انتہا (extreme) ہے۔

تعریف کے معاملے میں نوکروں سے بھی بے اعتنائی نہ برتیں۔ اگر آپ کے ہاں کوئی ملازمہ کھانا پکاتی ہے اور کسی دن کھانا اچھا لگا تو کہہ دیجیے آج کھانا اچھا تھا۔ یا جھاڑو پوچھا کرنے والی ہے کسی دن گھر خوب صاف کر کے چمکا دیا، بیت الخلاء (washrooms) اچھی طرح سے دھو دیے تو شکر یہ ادا کریں اور کہہ دیں کہ بہت اچھی صفائی کی، دل خوش کر دیا وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح اس کا دل بڑھے گا لیکن ہم سوچتے ہیں کہ اگر ہم تعریف کریں گے تو یہ سر پر چڑھ جائیں گے۔ جیسے ہم تعریف سن کر خوش ہوتے ہیں ایسے ہی دوسروں کو بھی خوشیاں دیں۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب قول النبی ﷺ انا بک لمحزونون

معذرت کرنے میں بخل:

اگر کبھی کوئی قصور یا بھول چُوک ہو جائے تو معذرت (sorry) کرنے میں بخل نہ کریں۔ اس معاملے میں ہم بہت زیادہ بخل کرتے ہیں کیوں کہ معذرت کرنے سے ہماری انا پرزد پڑتی ہے۔ اور ہم سمجھ چکے ہیں کہ تزکیہ کا آغاز ہی انا کی درنگی سے ہوتا ہے۔ اگر کبھی بلا وجہ کسی غلط فہمی کی بنا پر آپ نے ڈرائیور یا ملازم کو ڈانٹ دیا تو اپنی غلطی کا احساس ہو جانے پر نوکر سے معذرت کر لیں۔ کہہ دیں کہ مجھ سے غلطی ہوئی یا میں غلط سمجھا، آپ کا قصور نہیں تھا میں نے خواہ مخواہ آپ کو ڈانٹ دیا۔ معذرت کرنے سے بخل کی عزت گھٹتی ہے سخی انسان کی نہیں۔ انسان جتنا سخی ہوتا ہے اتنا ہی باعزت ہوتا ہے۔ اگر آپ کسی سے معافی مانگیں گے تو وہ آپ کی زیادہ عزت کرنے لگے گا۔ وہ آپ سے دیکھے گا کہ بڑوں سے بھی غلطی ہو جاتی ہے اور غلطی مان لینا اچھی بات ہے، جب ہم غلطی ماننے میں بخل کرتے ہیں تو بچے ہم سے یہی بات سیکھتے ہیں کہ غلطی کا اقرار نہ کیا جائے بلکہ چھپائی جائے۔ لہذا آپ کے بچے بھی آپ کی طرح اپنی غلطی نہیں مانیں گے اور نہ معافی مانگیں گے۔

غفلت کا بخل:

غفلت کا شمار بھی بخل میں ہوتا ہے یعنی جس کام کو جتنا وقت دینا چاہیے اتنا نہ دینا۔ کسی کام کو جتنا وقت دینا چاہیے تھا اُس کو اتنا وقت نہ دے کر آپ نے نظر انداز (neglect) کیا یا اپنی ذمہ داری ایمانداری سے نہ نبھائی، یہ بھی غفلت کی مثال ہے۔ جس چیز کا جتنا حق ہے اُس کو اتنا حق دے دینا چاہیے۔

روز مرہ استعمال ہونے والی اشیاء میں بخل:

بعض دفعہ پڑوسی کوئی چیز مانگتے ہیں، کبھی کوئی مشین مانگ لی، برتن مانگ لیے، آلو بیاز جیسی چھوٹی موٹی چیزیں مانگ لیں، ان میں ہاتھ روکنا بخل ہے۔ سورہ ماعون میں اسی کا تذکرہ ہے۔ پڑوسیوں میں چیزوں کا تبادلہ ہونا چاہیے، ضرورت پڑنے پر یہ چیزیں ایک دوسرے کو دینی، (share) کرنی چاہئیں۔

بعض دفعہ نوکروں کو تنخواہ دیتے وقت یا کوئی گھلا مانگ لے تو ہم ڈھونڈ کر پڑانا نوٹ دیتے ہیں، نیا نوٹ نہیں دیتے، یہ بھی ایک طرح سے بخل ہے۔ یہ کوئی گناہ ثواب کا معاملہ نہیں مگر یہ عمل ہماری سوچ کی عکاسی کرتا ہے۔ بازار میں بھی گھلتے پیسے ہونے کے باوجود کاندرا کو بڑا نوٹ دیتے

ہیں۔ وہ گھلے پیسے مانگ لے تو جھوٹ بول دیتے ہیں کہ ہمارے پاس تو بندھے ہوئے ہی ہیں، ہمارے پاس گھلا نہیں۔ دوسو کی خریداری کر کے پانچ ہزار روپے کا نوٹ دیتے ہیں۔ اب آپ دیکھیں کہ بغل کی وجہ سے جھوٹ بھی بولنا پڑا جو کہ یقیناً گناہ ہے لہذا ان چیزوں میں محتاط رہیں۔

دنیا میں آج کتنے امیر لوگ ہیں جو ٹیکس (tax) چوری کرتے ہیں۔ ایک خاتون کے بارے میں اخبار میں آیا تھا کہ لکھ پتی (millionaire) ہے لیکن اُس کا اپنا بچہ خیراتی ہسپتال میں مر گیا۔ ایسے لوگ پیسے سینت سینت کر رکھتے ہیں، لوگوں کی مدد نہیں کرتے، قرض نہیں دیتے، سمجھتے ہیں کہ یہ دولت اُن کے بُرے وقت میں کام آئیگی۔ پیسہ خرچ کرنے سے بہت گھبراتے ہیں، یہ ہیں وہ عبدالدینار جھوں نے پیسے کو اپنا معبود بنایا ہوا ہے۔ ایسا شخص پیسہ جمع کرتا ہے، گن گن کر رکھتا ہے خواہشات تو دور کی بات ضروریات پر بھی خرچ نہیں کرتا اور بس پیسہ کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے لیکن اُس کی یہ خوشی بھی عارضی ہوتی ہے۔

بغل کا علاج:

کنجوس ہر وقت بے چین رہتا ہے۔ اُسے ہر وقت یہ دھڑ کہ لگا رہتا ہے کہ کہیں کوئی مجھ سے پیسے نہ مانگ لے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ ایک شخص کسی بزرگ کے پاس آیا اور بہت رویا، اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ بزرگ نے پوچھا کیا تکلیف ہے؟ بولا میں اچھا خاصا دولت مند ہوں لیکن جب کسی سوالی یا فقیر کو اپنی طرف آتا دیکھتا ہوں تو مجھے لگتا ہے جیسے موت آرہی ہے۔ میرا علاج کر دیجیے! مجھے ہر وقت خوف رہتا ہے کہ ابھی کوئی آکر مجھ سے کچھ مانگ لگا، مجھے پیسے سے جدا ہونے کا خوف ہر وقت دامن گیر رہتا ہے۔ انہوں نے کہا اس کا علاج صبر اور مشقت ہے کہ بندہ زبردستی پیسے کو خود سے جدا کرتا رہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بیماری کا علاج بتاتے ہوئے فرمایا کہ کسی بڑی بیماری کا علاج کرنا ہو تو پہلے اُس کو کسی چھوٹی بیماری میں بدل (convert) دو، تو چھوٹی بیماری کا علاج آسان ہوتا ہے۔ یہ حُب مال ایک بڑی بیماری ہے، اس کو حُب جاہ میں تبدیل کر دو جو کہ نسبتاً چھوٹی بیماری ہے، اس کا علاج آسان ہے۔ اُس سے کہو کہ جب تم مال خرچ کرو گے تو لوگ تمہاری عزت کریں گے، تمہارا نام ہوگا۔ یہ ہے ریا کاری لیکن اس کا علاج آسان ہے۔ آہستہ آہستہ وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا شروع کر دے گا۔ پہلے مال کی محبت سے چھٹکارا حاصل ہو جائے اور جب مال کی محبت دل سے کٹ جائے تو پھر اللہ کی راہ میں خرچ آسان ہو جاتا ہے۔ یہ ہے اس کا علاج!

دراصل بخیل کسی حال میں خوش نہیں ہوتا۔ کسی کے گھر مہمان بن کر جاتا ہے تو اس کا دل گھٹتا ہے کہ اب ان کو تحفے تحائف دینے پڑیں گے۔ اس کو کوئی چیز خوشی نہیں دیتی، نہ کسی کے آنے سے خوش ہوتا ہے اور نہ کسی کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ ہر وقت غم میں مبتلا رہتا ہے کیوں کہ پیسہ تو بذاتِ خود خوشی نہیں دے سکتا۔ بخیل ساری زندگی پیسہ بچاتا اور سنبھالتا رہتا ہے اور یہ غم اس کو کھائے جاتا ہے کہ کہیں کوئی ادھار نہ مانگ لے یا خرچ نہ کرنے پڑ جائیں، وہ اپنی اس نعمت کا حظ نہیں اٹھا پاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ پیسہ خرچ کرنے سے انسان کو سچی خوشی ملتی ہے، اپنی یا کسی اور کی ضرورت پوری کر کے اطمینان حاصل ہوتا ہے، روحانی خوشی اور سکون ملتا ہے۔ اس کے برعکس بخیل کوئی چیز خرید بھی لے تو اس کو اتنا سنبھال کر رکھتا ہے کہ استعمال کی نوبت ہی نہیں آتی، کوئی نعمت اس کو خوشی نہیں دیتی بلکہ مزید پریشانی (tension) کا سبب بن جاتی ہے۔

بخل اور اسراف کے درمیان اعتدال کا راستہ ہے۔ انسان معتدل روش اپنائے، مناسب رویہ رکھے۔ قرآن میں آتا ہے:

﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامًا﴾ (الفرقان: ۶۷)

”وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ بے جا اڑاتے ہیں اور نہ تنگی کو کام میں لاتے ہیں بلکہ اعتدال کے ساتھ نہ ضرورت سے زیادہ نہ کم۔“

پھر سورہ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسِطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا﴾ (۲۹)

”کہ اپنا ہاتھ نہ گلے سے (گردن سے) بندھا ہوا کر لو اور نہ بالکل کھول ہی دو۔ (کہ سچی

یکھ دے ڈالو اور انجام یہ ہو) کہ ملامت زدہ اور در ماندہ ہو کر بیٹھ جاؤ۔“

مطلب یہ کہ بالکل مٹھی بند (tight) نہ کر لو، اور نہ اتنا ہاتھ کھول لو کہ سب ہی لٹا دو۔ یہ کرو گے

تو خود ہی نقصان اٹھاؤ گے۔

رسول اکرم ﷺ کی ایک دعا ہے:

((اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْجَبْنِ وَأَعُوذُ بِكَ مِنَ الْبُخْلِ)) (۱)

”اے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں بزدلی سے اور کنجوسی سے۔“

(۱) صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب الاستعاذہ من أزدل العمر۔۔۔

ایک اور طویل و عاسنن نسائی میں ہے کہ ”اے اللہ مجھ کو تو میا نہ روی کی توفیق عطا فرما! میں جب غنی ہوں تب بھی اور فقیر ہوں تب بھی۔“

اور اگر بخل کرنا ہی ہے تو انسان گناہوں میں کرے، گناہ میں بخیل ہو جائے، گناہ کے کام میں اپنا ایک پیسہ بھی نہ لگائے، وقت کا ایک سکنینڈ بھی نہ لگائے۔
بخل اور اسراف یکجا:

کیا کوئی شخص ایسا ہو سکتا ہے جو بیک وقت مسرف بھی ہو اور بخیل بھی ہو! کیا یہ ممکن ہے! کس طرح سے ممکن ہوگا؟ دوسروں کے ساتھ بخیل اپنے ساتھ مسرف، جی ہاں۔ ایسے لوگ معاشرے میں پائے جاتے ہیں، اپنے لیے ہزاروں بھی خرچ کر دیں گے اپنی خواہشات پر بڑی خوشی سے لاکھوں لگا دیں گے، اور اگر کسی دوسرے کو تحفہ دینا ہو یا صدقہ، خیرات، زکوٰۃ وغیرہ دینی ہو یا کسی کی کوئی ضرورت پوری کرنی ہو تو ہاتھ گردن سے باندھ لیں گے۔ اعتدال اور احسن طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے لیے سادگی اور دوسروں کے لیے سخاوت کا رویہ رکھے۔ اس لیے کہ اپنے لیے مسرف اور دوسروں کے لیے بخیل اپنے آپ کو ہلاک کر دینے والی چیز ہے۔ دوسروں کو ان کی توقع سے زیادہ دیں۔

آپ ﷺ کے بارے میں آتا ہے کہ آپ ﷺ انتہائی سخی تھے، ”جو اد“ تھے۔ آپ ﷺ ہوا کی مانند سخی تھے۔ آپ ﷺ لوگوں کو ایسے دیا کرتے تھے کہ جیسے آپ ﷺ کو فقر کا کوئی اندیشہ ہی نہیں۔ لہذا ذخیرہ نہ کریں بلکہ سخی بننے کی کوشش کریں۔ الماریاں مت بھریں، سخاوت کریں۔ ذخیرہ انسان کو پریشان کر دیتا ہے۔ جتنی الماریاں اور تجوریاں ہلکی ہوں گی اتنے ہی آپ خوش رہیں گے۔

کیا کوئی غریب اسراف کرنے والا بھی ہو سکتا ہے؟ ایسے لوگ اپنی خواہشات پوری کرنے کے لیے حرام ذرائع اختیار کرتے ہیں، چور ہوتے ہیں۔ کیوں کہ اپنے پاس تو ہے نہیں لہذا شاہ خرچیوں کے لیے قرض لے لیا، دوسرے کا حق مار لیا، رشوت لے لی۔ یا پھر کثرت سے سوال کرنے والے ہوتے ہیں۔

بعض لوگ فرمائشوں میں اسراف کرتے ہیں، اتنا اسراف کرتے ہیں کہ ان کی فرمائشیں لاتنا ہی ہو جاتی ہیں۔ مثلاً اگر پتہ چل جائے کہ کوئی جاننے والا دینی جارہا ہے یا وہاں سے آرہا ہے تو فوراً لسٹ پکڑا دیں گے۔ بعض دفعہ لوگ رسماً بھی پوچھ لیتے ہیں کہ یہاں سے کچھ چاہیے تو نہیں؟

جواب میں ہم شیپو، جوتے، پرفیوم سے لے کر ہینڈ بیگ تک آرڈر کر دیتے ہیں، یہ زیادتی ہے۔ انسان کو چاہیے کہ ان چیزوں سے غنی ہو جائے، کہہ دے کہ کچھ نہیں چاہیے، اپنے ملک میں ہر چیز دستیاب ہے۔ غنی وہ ہے جس کو کسی چیز کی تمنا اور خواہش نہ ہو۔ کثرت کے ساتھ فرمائش کرنے والا ہی کثرت کے ساتھ سوال کرنے والا ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کو یہ عادت ہوتی ہے کہ کوئی امریکہ سے آرہا ہے تو اُس کو کہہ دیا یہ لادو وہاں سستا ہے، کوئی دہلی سے آرہا ہے تو اُس سے فرمائش کر دی کہ یہ لادو وہاں سستی ہے۔ حالانکہ کہیں کچھ سستا نہیں ہوتا اور پھر دوسروں کو تکلیف میں ڈالنا کہ اپنا سامان بھی اٹھائے اور آپ کا بوجھ بھی لادے، زیادہ وزن کی قیمت (over weight) بھی ادا کرے، کسٹم (custom) میں الگ پریشان ہو۔ یہ دوسروں کو مشکل میں ڈالنے والی بات ہے یہاں بھی ہمیں ذرا معتدل اور محتاط رہنے کی ضرورت ہے، اس میں اسراف نہ کریں۔ یہ چیز انسان کو پریشان کر دیتی ہے۔ بندہ غنی ہو جائے۔ غنی بہت اچھی چیز ہے، حدیث میں آتا ہے: (الغنی غنی النفس) (۱) جس کا نفس غنی ہے دراصل وہی غنی ہے۔ خواہشات اٹھتی ہی نہیں، چیزوں کو دیکھ کر دل لپچاتا ہی نہیں۔ اگر پیسہ ہے تو سخی ہونا بڑی اچھی بات ہے، سخی ہونا بڑی اچھی صفت ہے اس کو عربی میں کہتے ہیں ”جواد“ ہونا، ”کریم“ ہونا۔

بخل اور کفایت شعاری کا فرق:

بخل اور کفایت شعاری کا فرق سمجھنا بھی بہت ضروری ہے۔ بخل یہ ہے کہ باحیثیت ہوتے ہوئے بھی اپنی ضروریات اور دوسروں پر خرچ نہ کیا جائے، اگر خرچ کر بھی لیں تو بہت گھنیا چیزیں دیں۔ جب کہ کفایت شعاری یہ ہے کہ پیسہ کی کمی کے باوجود احسن طریقے سے خرچ کرنا کہ اس سے ساری ضروریات اچھی طرح پوری ہو جائیں۔ پیسے کو پھیلا کر ایسے پورا کرنا یا استعمال کرنا کہ تمام ضروریات اس میں سمٹ جائیں، دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے اور قرض لینے کی نوبت نہ آئے اور یہ کفایت شعاری انتہائی پسندیدہ صفت ہے۔

مثلاً ایک عورت ہے اس کے پاس کم پیسہ ہے وہ بچوں کے یونیفارم گھر میں سیتی ہے، اپنے شوہر کے کپڑے سیتی ہے، بچوں کو خود پڑھا لیتی ہے۔ یہ کفایت شعاری ہے کہ میاں کی کم تنخواہ میں سب اخراجات سمیٹ لیے، یہ بہت سلیقہ والی عورت ہے۔ انسان نہ اسراف کا شکار ہو اور نہ بخل کا۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب الغنی غنی النفس۔۔۔

دوستی میں، دشمنی میں، جذبات میں، روپے پیسے میں، وقت صرف کرنے میں نہ بخل کرے اور نہ اسراف کرے۔ جہاں تک دوستی اور دشمنی کا تعلق ہے اس کے بارے میں حضرت علیؓ کا قول ہے ”اپنے دوست کو کم کم چاہو، اپنے محبوب سے تھوڑی تھوڑی محبت کرو ہو سکتا ہے وہ ایک دن تمہارا دشمن ہو جائے“ تو محبت میں اسراف مت کرو آپ سے باہر نہ ہو جاؤ بلکہ اعتدال رکھو۔ اور دشمن کے بارے میں فرمایا کہ ”اپنے دشمن سے تھوڑی دشمنی رکھو ہو سکتا ہے وہ ایک دن تمہارا دوست بن جائے“ تو دشمنی میں بھی حد سے مت گزرو کہ ایک دن وہ تمہارا دوست بن جائے اور تمہیں دشمنی میں کیے گئے کاموں پر افسوس اور شرمندگی ہو۔

خلاصہ :

اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کا اعتراف کرنے میں مت ہچکچائیں، اُن کو مانیں تب ہی علاج ہو سکے گا۔ اپنی غلطی اور کمزوری مان لینا، اعتراف کر لینا ہی اصلاح کا پہلا قدم ہے یہ عین انسانیت ہے۔ صدقات و خیرات سے غریبوں اور ملازموں کی دل کھول کر مدد کریں۔ اس میں برکت اور بھلائی ہے۔ اچھی اور کام کی چیزیں دیں۔ عورتیں سوٹ دیتے وقت دوپٹہ غائب نہ کریں۔ بیٹیوں والی ماؤں سے تھوڑی بہت کنجوسی ہو ہی جاتی ہیں، دوپٹہ اگر ٹھیک ٹھاک ہے تو یہ سوچ کر رکھ لیا کہ بیٹی کے کام آجائے گا۔ اپنے قیمتی اور اچھے کپڑے مانیں اپنی بیٹیوں کے لیے رکھ دیتی ہیں مگر جب ان کے پہننے کا وقت آتا ہے تو فیشن بدل چکا ہوتا ہے اور بیٹیاں پہننے سے انکار کر دیتی ہیں۔ آپ یہ سوچیں کہ آج آپ نے کسی کی ضرورت پوری کی تو کل ان شاء اللہ جب آپ کے بچوں کی شادی کا وقت آئے گا تو اللہ آپ کی ضرورت پوری کرے گا، اللہ آپ کو محروم نہیں کرے گا۔ بچوں کا حوصلہ (encourage) بڑھائیں کہ وہ اسکول میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھانا، پنسل، کاپی وغیرہ مل جل کر استعمال کریں۔ یہ اچھی عادت ہے اپنے بچوں میں سخاوت کا بیج بویں۔

پسند اور صلاحیت ہوتے ہوئے بھی دین کے راستے میں نہ لگنا، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے خرچ نہ کرنا، اس بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

{وَمَنْ يَبْخُلْ فَإِنَّمَا يَبْخُلْ عَنِ نَفْسِهِ} (محمد ﷺ: ۳۸)

”جو بخل کرتا ہے وہ اپنے آپ سے بخل کرتا ہے۔“

اللہ کو تو ضرورت نہیں ہے وہ تو بے نیاز ہے اسی آیت میں آگے آتا ہے کہ اللہ تو غنی ہے تم ہی

محتاج ہو، تمہیں ضرورت ہے۔ اللہ کی راہ میں ضرور وقت دو، صلاحیت لگاؤ اور پیسہ لگاؤ۔

اپنے بچوں سے خوب پیار کریں انہیں احساس دلائیں کہ آپ کو وہ بہت محبوب ہیں، کہا جاتا ہے کہ بچوں کو بہت پیچ پیچ نہ کیا کرووہ خراب ہو جائیں گے۔ یہ بات غلط ہے بچوں کو ضرور بتائیں کہ آپ اُن سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ زیادہ پیار سے کوئی نہیں بگڑتا بلکہ بچے بے جا پیار سے بگڑتے ہیں، ڈانٹ کے موقع پر بھی آپ درگزر کر دیں اور غلطی پر نہ ٹوکیں تو بگڑنے کا اندیشہ ہے۔ اسی طرح ماں سے محبت کا اظہار کریں، شوہر سے محبت کا اظہار کریں اس میں کوئی خرابی نہیں بلکہ یہ تو خیر ہی خیر ہے۔ اُن کو بتائیں جب آپ نہیں ہوتے تو ہم آپ کو یاد (miss) کرتے ہیں بچوں سے بھی کیسے کہ آپ یاد آتے ہیں، اس سے تعلقات میں مضبوطی آتی ہے، محبت بڑھتی ہے، اس میں اسراف نہ ہو لیکن جذبات کا اظہار ضرور ہو۔ یہ زندگی کو خوش گوار بنا دیتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے کسی سے پوچھا، ”کیا تجھے فلاں سے محبت ہے؟“ اس نے کہا ”ہاں“ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”جا کر اس کو بتاؤ کہ تمہیں اس سے محبت ہے۔“ اس سے آپس کے تعلقات سنورتے ہیں، دعوتوں کے بعد یا پورے گھر کی صفائی کے بعد نوکروں کو خوش کر دیا کریں، شاباشی دے کر یا کام کی تعریف کر کے اس میں بخل نہ کریں۔ مرد ملازمین کے ساتھ گھر کے حضرات ایسا رویہ اختیار کر سکتے ہیں۔

نافع علم میں بھی بخل کیا جاتا ہے۔ لوگ کھانے کی ترکیبیں (recipes) نہیں بتاتے، درزی کی دکان کا نام نہیں بتاتے یا کسی جگہ سستی چیزیں مل رہی ہوں تو وہاں کا پتہ نہیں بتاتے وغیرہ وغیرہ۔ اس سب کا علاج یہ ہے کہ اپنے آپ کو یہ باور کرائیں کہ اللہ نے جس کی قسمت میں جو لکھ دیا ہے وہ اُس کو مل کر رہے گا۔ ہاں اگر آپ اُس کا ذریعہ بنیں گے تو آپ کو اجر مل جائے گا ورنہ اللہ کسی اور سے یہ کام لے لے گا۔

کسی نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ میں اللہ کی راہ میں دینا چاہتا ہوں مگر مستحق اور غیر مستحق کا فرق نہیں کر پاتا۔ انہوں نے کہا دونوں کو دو کیوں کہ اللہ تجھ کو وہ بھی دیتا ہے جس کا تو مستحق ہے اور وہ بھی جس کا تو مستحق نہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک فرشتہ اترتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ ”اے اللہ جو تیری راہ میں خرچ کرتا ہے اس کو اور دے۔“ ایک اور فرشتہ اترتا ہے اور کہتا ہے ”اے اللہ جو روک کر رکھتا ہے اس کا مال برباد کر دے اس کا مال فنا کر دے۔“ قرآن میں ہم نے پڑھا ہے کہ جو تم خرچ کرتے ہو اس کے پیچھے اللہ اور لے آتا ہے، کسی کو کمی نہیں ہوتی۔ کیا کسی کو اللہ کی راہ میں خرچ کر کے کمی ہوئی؟ ہم غریبوں کو کھانا کھلائیں گے تو کیا اللہ ہمیں بھوکے پیٹ سلائے گا؟ دراصل

برکت بڑی چیز ہے لیکن بخل کرنے سے برکت اٹھ جاتی ہے۔ فیاضی اور سخاوت سے برکت آتی ہے۔ دیتے وقت یہ سوچیں کہ شاید میں زندگی میں آخری بار دے رہے ہیں پھر شاید موقع ہی نہ ملے۔ محروم، سائل اور غریب کو دیتے وقت اُس کے ممنون رہیں کہ اُس نے ہمارا مال قبول کیا اور شکر ادا کرنا چاہیے کہ اللہ نے ہمیں دینے والا بنایا ہے۔ اور دعا کریں کہ اللہ ہمیشہ دینے والوں میں رکھے، مانگنے والا نہ بنائے۔ حدیث میں آتا ہے کہ:

((الْيَدُ الْعَلِيَّةُ خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلَى)) (۱)

”اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔“

ایک طویل حدیث میں مضمون آتا ہے کہ:

((إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ يَقُولُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَا ابْنَ آدَمَ اسْتَطْعَمَكَ فَلَمْ تَطْعَمْنِي قَالَ يَارَبِّ وَكَيْفَ أَطْعَمَكَ وَأَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِينَ قَالَ أَمَا عَلِمْتَ أَنَّهُ اسْتَطْعَمَكَ عَبْدِي فَلَانَ فَلَمْ تَطْعَمَهُ أَمَا عَلِمْتَ أَنَّكَ لَوْ أَطْعَمْتَهُ لَوَجَدْتَ ذَلِكَ عِنْدِي)) (۲)

”اللہ قیامت کے دن بندے سے کہے گا کہ اے میرے بندے میں بھوکا تھا تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا۔ تو بندہ کہے گا کہ اے اللہ میں تجھے کیسے کھلا سکتا ہوں تو تو دونوں جہانوں کا رب ہے۔ تو اللہ کہے گا کیا تجھے یاد نہیں کہ تجھ سے میرے فلاں بندے نے کھانا مانگا تھا، تو نے اسے نہ کھلایا، کیا تو جانتا نہیں کہ اگر تو اسے کھلاتا تو مجھے اُس کے پاس پاتا۔“

حدیث میں یہ مضمون بھی آتا ہے کہ مانگنے والے سوالی کے ہاتھ کے اوپر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے تو انسان اللہ کے ہاتھ پر اچھی اور بہتر چیز رکھے۔ اللہ سے بخل سے حفاظت اور سخاوت کی دعا مانگے۔ ایک اور دعا ہے کہ ”اللہ تعالیٰ ہمیں بخل سے بچالے“۔ نہ شریعت میں بخل کریں، نہ ہم مروت میں، نہ جذبات میں بخل کریں اور نہ لوگوں کے ساتھ تعلقات نبھانے میں بخل کریں۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب الزکاة، باب لا صدقة عن ظهر الغنی

(۲) ریاض الصالحین، کتاب عیادة المریض، وتشیيع الميت، باب عیادة المریض

دکھاوا

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے دکھاوے کے لیے ”ریا“ اور اترانے کے لیے ”بطر“ کا لفظ استعمال کیا ہے۔

{وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطْرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَاللَّهُ بِبِئْسَ يَعْمَلُونَ مُحِيطًا} (الانفال: ۴)

”تم اُن لوگوں کی مانند مت ہو جانا جو اپنے گھروں سے نکلے اتراتے ہوئے اور وہ لوگوں کو روکتے ہیں اللہ کے راستے سے اور جو کچھ وہ عمل کرتے ہیں اللہ اُس پر محیط ہے۔“

اس آیت میں دو الفاظ آئے ہیں۔ ”بطر“ اور ”ریا“۔ ان دونوں کے معنی دکھاوا یا اترانا ہیں لیکن ان میں فرق یہ ہے کہ ریا کاری ہر چیز میں کی جاسکتی ہے یعنی عبادت میں، کسی صلاحیت میں یا کسی اور چیز میں جب کہ بطر صرف مال و دولت میں دکھاوے کے ساتھ مخصوص ہے۔

سورۃ القصص کی آیت ۵۸ میں فرمایا:

{وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطَرَتْ مَعِيشَتَهَا فَتِلْكَ مَسَلِكُنْهُمْ لَمْ تَسْكَنْ مِنْ بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ}

”اور کتنی ہی بستیاں ہیں جن کو ہم نے ہلاک کر دیا، انہیں اپنی معیشت پر بطر تھا۔ یہ اُن کے گھر ہیں، کوئی ان کے بعد ان میں نہ بسا۔ مگر بہت تھوڑے لوگ بسے اور ہم ہی اُن کے وارث تھے۔“

”بطر“ زیادہ سے زیادہ سازو سامان جمع کرنے کی بے لگام خواہش کا نام ہے۔ (unbridled desire to need and want more and more) یعنی دولت کا شوق اس قدر بڑھ جائے کہ انسان کی زندگی کا مقصد ہی محض دولت کمانا اور خرچ کرنا رہ جائے اور دولت سے جو چیزیں حاصل ہوں ان کے بارے میں انتہائی مسرت ہو۔ یوں سمجھے ”بطر“ ایک خاص رویہ کا، ایک اخلاقی بیماری کا نام ہے۔ خود ستائش (smug) ہو جانا، معیار زندگی (standard of living) کے لیے تگ و دو کرنا بلکہ معیار زندگی کو ہی پوجنا شروع کر دینا۔ اور زندگی کا مقصد معیار زندگی کو بلند سے بلند تر کرنا ہو جائے، پیسہ کمانے کا اور خرچ کرنے کا چمکا (obsession) لگ جائے۔ اس کا مشاہدہ ہم اشتہارات میں کر سکتے ہیں جس طرح اشتہارات میں انسانی جذبات کو براہِ بیخونہ دکھایا جاتا ہے کہ منہ کھلے ہوئے ہیں، چہروں پر مسرت (ecstasy)

ہے، مصنوعی خوشی کا اظہار ہو رہا ہے، کوئی آئس کریم (ice cream) کھا کر، کوئی چہرے پر گریم (face cream) لگا کر، کوئی کار خرید کر دیوانہ ہوا جا رہا ہے، ہانچھیں کھلی ہوئی ہیں، نرم گدوں کے خواب دکھ رہے ہیں، قالینوں کے، پردوں اور صوفوں کے، عالیشان بنگلوں اور کوشیوں کے سپنوں میں گم ہیں، گل آرزو اور گل ارمان یہی ہیں۔ جس کے پاس یہ سب ہے وہ انہی کی باتیں کر رہا ہے اور جس کے پاس نہیں ہے وہ ان ہی کے خواب دکھ رہا ہے اور اگر کسی کو یہ حقیر سی متاع مل جائے تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سارہا۔

دکھاوے اور بطر کے معاشی اثرات:

دکھاوے اور بطر میں مال و دولت کا اظہار آگے بڑھ کر بیماری کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اس طرح سے کہ وہ لوگ جو اپنے ذرائع آمدنی میں ان چیزوں کو حاصل نہیں کر سکتے وہ اپنی استطاعت سے بڑھ کر خرچ کرتے ہیں، قرض لے کر سامان آسائش خریدتے ہیں، مصنوعی طور پر معیار زندگی (false living standard) بڑھا لیتے ہیں۔ اسی وجہ سے کریڈٹ کارڈ (credit card) کا کلچر وجود میں آیا ہے۔ دوسروں کے کُسن سے، دولت و شہرت سے، معیار زندگی اور نسلی برتری سے مرعوب ہوتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف جس کے پاس یہ نعمتیں ہیں وہ خوب اتراتے ہیں اور اسی کے اندر گن رہتے ہیں۔ اعلیٰ ترین چیز خرید کر گھر میں رکھنا اور اس سے لوگوں کو مرعوب کرنا زندگی کا مقصد ہوتا ہے۔ اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے قرض بھی لینا پڑے تو لیتے ہیں۔

یہ سورہٴ قصص کی بڑی اہم آیت ہے:

{وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَوْمٍ لَّهُمْ بَطْرٌ مَعِيشَتُهُمَا} (القصص: ۵۸)

”اور کتنی ہی بستیاں ہم تباہ کر چکے ہیں جن کے لوگ اپنی معیشت پر اتر گئے تھے۔“

جب لوگوں میں دکھاوا اور بطر آجاتا ہے تو ان کی معیشت بھی ایک خاص رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ معیشت (economy) ایک خاص رُخ پر چل پڑتی ہے۔ اپنی حد سے بڑھ کر خرچ کرنا (living beyond means) ایک مرض بن جاتا ہے۔ اپنی حیثیت سے بڑھ کر زندگی گزارنے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور پھر یہ نفسیات کریڈٹ کارڈ تہذیب (credit card culture) کو جنم دیتی ہے۔ جیسے آجکل ہمارے ہاں رواج ہے، تنخواہ کم ہے، حیثیت نہیں ہے لیکن کریڈٹ کارڈ (credit card) پر گاڑی یا فرنیچر (furniture) خرید لیں گے۔ یہ مرض جس معاشرے میں آجائے تو پھر وہاں کسی کا گھر، رہن سہن دیکھ کر آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ وہ

کتنا کمارہا ہے کیوں کہ جو بیس ہزار کمارہا ہے وہ بھی دو لاکھ کی چیز خرید لیتا ہے اور جو دو لاکھ کمارہا ہے وہ تو کروڑوں کی باتیں کرنے لگتا ہے۔ تو معیار زندگی (living standard) کو مصنوعی طور پر بڑھا لینا چاہے باقی زندگی میں کتنی ہی مشکل اٹھانی پڑے، قرض کے پہاڑ کھڑے ہو جائیں، ”دکھاوے“ کی علامت ہے۔ ایسے لوگ بازاروں سے جنون کی حد تک محبت کرتے ہیں۔ برانڈ کے نام (brand names) انہی کے دم سے چلتے ہیں، اس سے کم پران کا گزارہ نہیں ہوتا۔

دکھاوا کرنے والوں کا ایک اور رویہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اگر یہ کہیں چھٹی گزارنے گئے تو ان کو اس بات سے کم ہی مطلب ہوگا کہ ہمیں کہاں زیادہ مزہ آئے گا، کس جگہ تفریح کا موقع ہوگا، بس ان کو اس بات سے مطلب ہوتا ہے کہ کس ہوٹل (hotel) میں رہیں گے اور اگر سفر کیا تو فرسٹ کلاس میں سفر کریں گے یا نہیں۔ نچلے درجے (economy class) میں سفر کرنا ان کے لیے انتہائی بے عزتی کا باعث ہوتا ہے، کسی کو کیا بتائیں گے کہ ہم نے عوامی کلاس میں سفر کیا۔ یہ سب ”دکھاوے“ کی علامات ہیں۔

آپ نوٹ کر رہے ہوں گے کہ اترانا اور دکھاوا ساتھ ساتھ چل رہے ہیں اسی لیے شروع میں وضاحت کی تھی کہ ”بطر“ ایک دل کی بیماری ہے اور اس کا اظہار دکھاوے اور اترانے میں ہوتا ہے۔ جن کے اندر بطر ہوتا ہے وہ اپنی ذات کو بہت نمایاں کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا اظہار آپ کو اپنے معاشرے میں نظر آئے گا بد قسمتی سے ہماری بستی بھی اُن بستیوں میں ہے کہ جہاں ”دکھاوا اور بطر“ پائے جاتے ہیں۔

جشن تہنیت:

”دکھاوے اور اتراہٹ“ کا لازمی نتیجہ خوشی منانے میں اسراف ہے۔ کسی معاشرے میں اگر یہ مرض دیکھنا ہے تو وہاں کی شادی ملاحظہ کر لیں۔ بلاشبہ شادی کا موقع بہت مبارک ہوتا ہے لیکن اگر معاشرے میں دکھاوے کا داعیہ ہے تو اس کا اندازہ آپ کو شادی کی تقریبات سرسری نگاہ میں دیکھنے سے ہی ہو جائے گا، صرف شادی کا کارڈ دیکھ کر بھی ہو جائے گا۔ کیوں کہ اب تو پوری پوری کتابیں چھپنے لگی ہیں، جمل لگے ہوتے ہیں، گوٹے کناریاں اور ربن لگے ہوتے ہیں، اور نہ جانے کیا کیا لگایا جاتا ہے۔ مہندی کا الگ، مایوں کا الگ، بارات کا الگ اور ولیمہ کا الگ کارڈ چھپتا ہے۔ اور اُس شادی کے کارڈ کا مصرف کیا ہے، بس یہ اطلاع دینی مقصود ہے کہ تقریب کب اور کہاں منعقد کی

جارہی ہے، تاریخ اور وقت کیا ہے، جگہ کون سی ہے۔ صرف تاریخ پڑھ کر کچرے کی ٹوکرے (dustbin) کی نظر کر دیا جاتا ہے۔ یہ اطلاع اگر ایک دس پندرہ روپے کے کارڈ پر یا کسی کاغذ پر لکھ کر لگانے میں ڈال کر بھیج دی جائے تو بھی مسئلہ حل ہو جاتا، اطلاع پہنچ جاتی۔ لیکن یہاں مقصد صرف اطلاع دینا نہیں ہے، ساتھ ساتھ دکھاوا بھی ہے۔ دیکھیں مقصد ٹھیک ہونے کے باوجود دکھاوے کی وجہ سے گناہ سرزد ہو گیا۔

جس کے اندر ”دکھاوا“ ہوتا ہے وہ اپنے لیے بہت ساری محافل سجانا چاہتا ہے، وہ بتانا چاہتا ہے کہ دیکھو میرے پاس کتنا کچھ ہے۔ کسی چیز کو صرف حاصل کرنے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس کی نمائش (display) بھی کرتا ہے۔ اس وجہ سے اخباروں میں بڑے بڑے اشتہارات (advertisements) ہمیں ملتے ہیں۔ موت کے موقع پر بھی دکھاوے سے باز نہیں آتے، آدھے آدھے صفحے کے اعلان چھپواتے ہیں تاکہ لوگ جان جائیں کہ پیسے والے کا انتقال ہوا ہے اور اب تو یہ مرض قبرستانوں تک پہنچ گیا ہے، مردے کو دفنانے کے لیے بھی نام والا قبرستان ہو۔ اعلیٰ درجے کے علاقے میں ہو، عام سے قبرستان میں کیسے دفنائیں؟ اللہ نے فرمایا ہے نا!

{ اَلْهٰكُمُ الشَّكَاوَةُ حَتّٰی زُرْتُمْ الْمَقَابِرَ } (التکاور)

”عافل کر رکھا تم کو اس تکاثر کی دوڑ نے۔ یہاں تک کہ تم نے قبریں دیکھ لیں۔“

کسی مشہور قبرستان میں اگر جگہ ختم ہو جائے تو دوسری منزل بنا کر کسی مردے کے اوپر دفنا دیتے ہیں۔ مگر کسی چھوٹے موٹے قبرستان لے کر نہیں جاتے۔

بچوں میں بطور:

سورہ لقمن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

{ وَلَا تَصْعَقْ حَدَاكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْسِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ

فَخَوْرٍ } (لقمن: ۱۸)

”اور اپنے گالوں کو لوگوں کے لیے پھیلا کر مت رکھنا اور زمین میں اکڑا کر مت چلنا، بلاشبہ اللہ تعالیٰ شیخی خورے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔“

یہ دراصل حکیم لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہے ہیں۔ ہمارا کام یہ ہے کہ اپنے بچوں کو اترا نے سے بچائیں۔ مہنگی سے مہنگی اور قیمتی سے قیمتی اشیاء استعمال کرنے کی عادت سے بچائیں۔ دراصل

ماں باپ بچپن ہی سے بچوں کے اندر یہ جذبہ (tendency) ڈال دیتے ہیں۔ مثلاً ایک سے ایک قیمتی (fancy) پنسل بکس دینا، ایسی گھڑی دلوانا جو بچے سے زیادہ عالم ہوتی ہے وقت تو بتاتی ہی ہے ساتھ ساتھ مہینہ، دن اور تاریخ بھی بتاتی ہے۔ کیلکولیٹر (calculator) بھی ہے، الارم (alarm) بھی ہے، میوزک بھی بجاتی ہے، سبھی کچھ کرتی ہے۔ یا پھر اُن کو مہنگے بستے دلاتے ہیں تاکہ اسکول میں دوسرے بچے دیکھ کر اُن کے بچوں سے مرعوب ہوں۔ کہیں چھٹیاں گزار کر آئیں گے تو لوگوں کو بلا بلا کر اس کی ویڈیو (video) دکھائیں گے، تصویریں دکھائیں گے کوئی دیکھنا چاہے یا نہ چاہے۔

دوسروں سے بھی دکھاوے اور بطور کا تقاضا:

ہمارے معاشرے میں لوگوں کا حال یہ ہے کہ خود تو دکھاوا کرتے ہیں، اتراتے ہیں ساتھ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہمارے دوست احباب بھی دکھاوا کریں، جو مہمان ہماری دعوت میں شرکت کریں تو وہ بھی ہمارے رنگ میں رنگ جائیں، سوٹ بوٹ پہن کر تیار (dressed up) ہوں تاکہ پتہ چلے کہ ہمارے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے بھی ہماری طرح امیر کبیر ہیں۔ دعوت نامے پر لکھ دیا جاتا ہے کہ مہندی ہے تو ہرا جوڑا پہن کر آئیں، مایوں ہے تو زرد رنگ کا لباس ہو، اور شادی پر لال رنگ کے کپڑے پہن کر آئیں۔ اور شادیوں میں جو لوگ بارات کے ساتھ جانے والے ہوں یا ولیمہ میں ساتھ ہوں تو ان سے بھی بھاری زیور اور جوڑوں کی فرمائش کی جاتی ہے، یہ دکھانے کے لیے کہ ہمارے رشتے دار اتنے امیر کبیر ہیں۔ تو انسانوں کی تو کوئی حیثیت (value) نہ رہی۔ ہاں مہمان نے کیا پہنا ہے اس کی اہمیت ہے۔ ایسے چھوٹے چھوٹے معیارات بن جاتے ہیں اور پھر جس کے پاس ایسا لباس نہیں ایسے مہمانوں کو اپنے ساتھ نہیں لے کر جاتے۔ اس حد تک دکھاوا راج بس گیا ہے۔ یاد رکھیں یہ لبطر اور ری کاری بر باد کرنے والی چیزیں ہیں، قوموں کو ہلاک اور برباد کر دیتی ہیں۔

چھوٹے چھوٹے بچوں کی خوشی کا جشن (celebration) نہایت اہتمام سے منایا جاتا ہے، دھوم دھڑکے سے اُن کی سالگرہ (birthday) منائی جاتی ہے۔ اب وہ زمانہ گیا کہ صرف ایک کیک کاٹ کر سالگرہ ختم ہو جائے اب تو سالگرہ (birthday) کا باقاعدہ موضوع (theme) ہوتا ہے۔ کسی کا موضوع سٹڈریلا (cinderella) ہے۔ اس میں ایک سببی سجائی گئی ہے جس میں سب مہمان بچوں کو باری باری سیر کرائی جاتی ہے، غبارے ہیں، ربن ہیں، رنگارنگ سجاوٹ ہے اور سارے تحفے ایک طرف سجے ہوئے ہیں۔ اور جس کی سالگرہ ہے وہ سب کی نگاہوں

اور تو جب کامرکز ہوتا ہے۔ لاکھوں روپے ان تقاریب (occasions) پر خرچ ہوتے ہیں۔ نتیجتاً جو بچے تقریب میں آتے ہیں وہ بھی اپنے والدین سے اسی قسم کی سالگرہ منانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ لہذا پورا معاشرہ ”دکھاوے“ کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ بعض دفعہ لوگ تحفہ دیتے ہوئے قیمت کا لیبل (price tag) نہیں ہٹاتے تاکہ پتہ چلے کہ کتنا قیمتی تحفہ دیا ہے؟ بطور کا اظہار یوں بھی ہوتا ہے کہ چیز معمولی سی دوکان سے خریدی اور پھر اس کو قیمتی (fancy) تھیلے یا لفافے میں بند (pack) کر کے دے دیا۔ بعض لوگ قیمتی تھیلے سنبھال کر رکھتے ہیں تاکہ ہم اپنی چیز ان تھیلوں میں رکھ کر کے اپنی بڑائی ظاہر کر سکیں۔ دہی یا انگلیڈ سے لائے ہوئے تھیلے (shopping bags) سنبھال کر رکھ لیتے ہیں۔

آج پوری دنیا دکھاوے اور بطور کی لپیٹ میں ہے، اور بطور ہے ہی پیسے والوں کا مرض۔ امیر ملکوں سے یہ مرض شروع ہوتا ہے، ترقی یافتہ اور دولت مند ممالک اپنی دولت کا اظہار کرتے ہیں اور پھر ان کی دیکھا دیکھی غریب ممالک بھی وہی سب شروع کر دیتے ہیں۔ آج کی دنیا میں ”دکھاوا اور بطور“ ہے ہی یورپ اور امریکہ کا مرض، وہاں سے ہوتے ہوتے یہ مرض ہمارے ملک جیسے ملکوں میں بھی آجاتا ہے۔ ان ملکوں میں تمام کاروبار کریڈٹ کارڈ (credit card) پر چلتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہر امریکی بچہ پیدا ہوتے ہی 40,000 ڈالر کا مقروض ہوتا ہے۔ ہسپتالوں کے بل سے لے کر فرنیچر، گاڑیاں سب کچھ کریڈٹ کارڈ (credit card) پر لیا جاتا ہے۔

اس نمائش کی حوصلہ افزائی اشتہارات کے ذریعے بھی بہت زیادہ کی جاتی ہے کہ دنیا کی چیزوں کو دیکھ کر خوشی سے پھٹ پڑنا۔ دنیاوی اشیاء، عیش و عشرت اور سامانِ آسائش کے اشتہارات کو غور سے دیکھا کریں۔ کسی کے ہاتھ میں آئس کریم (ice cream) ہے تو اُس کی آنکھیں پھٹی ہوئی ہیں اور بانجھیں کھلی ہوئی ہیں، کوئی چاکلیٹ کھا رہا ہے تو دوسروں کا منہ کھلا ہوا ہے، برگر (burger) کھا رہے ہیں تو جھوم رہے ہیں۔ گاڑی دیکھی تو آپے سے باہر ہو گئے۔ کوئی سوتے میں گھر کا خواب دیکھ رہا ہے۔ یا کہیں بیٹھا ہے تو اوپر سے پیسے برستے ہوئے محسوس کر رہا ہے، انسانوں کو اس قسم کی لالچی خوشی کا تصور دیا جاتا ہے۔ ان اشتہارات کے ذریعے انسانوں کے ذہنوں میں یہ خیال بٹھا دیا گیا ہے کہ ہمارا سکون اطمینان اور خوشی کا دار و مدار صرف اچھا کھانے، اچھا پہننے اور اچھا رہن سہن اختیار کرنے میں ہے۔ ایسے لوگ نشہ آور مسرت (ecstasy) کا شکار لگتے ہیں۔ تمام

آسائشوں اور زبان کے چٹخاروں کی وجہ سے حواس باختہ ہو جاتے ہیں۔ اشتہارات میں یہاں تک دکھایا جاتا ہے کہ جس کے پاس اچھا (TV) ہوگا یا اچھی گاڑی ہوگی تو سب سے اچھی لڑکی اُسی کے ساتھ شادی کرے گی۔ بچے بھی یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اگر ماں باپ نے ہمیں فلاں موبائل نہیں دلوا یا تو وہ ہم سے محبت نہیں کرتے۔ اب تو لوگ بھی صرف ایسے تحفوں پر خوش ہوتے ہیں کہ جو ہنگے ہوں، یہ ہے بظہر کا مرض! کن جذبات کے ساتھ، کتنی مشکلات اُٹھا کر یہ تحفہ دیا گیا، کس نیت، کس محبت و خلوص سے دیا گیا اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

قارون سے بنی اسرائیل کے نیک لوگوں نے کہا تھا:

{لَا تَقْرَأُوا الْقُرْآنَ لَأَنْ يُحِبُّ الْفَرِحِينَ} (القصص: ۷۶)

”زیادہ خوشی سے مت پھول! اللہ حد سے زیادہ خوش ہونے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔“

بازاروں کے مسلسل چکر لگانا اور صرف اس لیے خریداری کرنا کہ اشتہار دیکھ لیا تھا اور جب حواسوں پر یہی چیزیں چھائی رہتی ہیں، اٹھتے بیٹھتے کپڑا، زیور، مشینی اشیاء (gadgets) انہی چیزوں کے بارے میں تذکرے اور باتیں ہوتی ہیں تو ایسا معاشرہ بظہر اور دکھاوے کا شکار ہو جاتا ہے۔ اپنی حیثیت سے بڑھ کر زندگی گزارنے کا شوق عام ہو جاتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب لوگوں میں قناعت تھی، آدمی جتنا کماتا تھا اُسی معیار (level) پر زندگی گزارتا تھا۔ جو امیر تھے اُن کے طور پر تھے مختلف تھے اور جو کم آمدنی والے تھے اُن کے طور پر تھے اور تھے۔ لیکن اب کوئی قناعت کی زندگی گزارنے پر راضی نہیں ہے، سب کو وہی چاہیے جو دوسروں کے پاس ہے تو اس طرح معاشرے میں ایک دوڑ (race) لگ جاتی ہے، چھوٹے چھوٹے بچوں کے ہاتھوں میں اب فون (cell phone) نظر آتے ہیں۔ ذرا سوچیں پانچویں جماعت کے بچے کون فون کی کیا ضرورت ہے، وہ بھی سب سے نیا (latest) ماڈل چاہیے، معمولی چیز کے لیے تیار نہیں ہوتے کیوں کہ ضرورت کے تحت نہیں لیتے بلکہ شوق کے لیے اور دوسروں کی دیکھا دیکھی خریدتے ہیں۔ اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ انسان کتنا ہی کمائے، اس کو پورا نہیں پڑتا۔ چین اور سکون رخصت ہو جاتا ہے۔ ایک (rat race) شروع ہو جاتی ہے، قناعت اُٹھ جاتی ہے۔

دکھاؤ اور اتر اندر اصل تباہ شدہ اقوام کا مرض تھا۔ وہ لوگ خود نمائی میں اتنے مصروف رہتے تھے کہ دوسروں کی تکلیف کا اندازہ تک نہیں ہوتا تھا، بالکل بے حس ہو گئے تھے۔ لوگوں کی قدر

واہمیت صرف اس چیز سے منسلک (attach) ہو کر رہ گئی تھی کہ انہوں نے کتنے کی چیز پہنی ہے یا کس طرح کے گھر میں رہتے ہیں، انسانی قدروں کو ناپنے کا آلہ مال و دولت رہ گیا تھا۔ دراصل یہ خالص مادہ پرستانہ ذہنیت ہے اور بطر کا تعلق اسی ذہنیت سے ہے۔ یعنی کہ مادے کی پوجا، دولت کی پرستش۔ زندگی کا مقصد ہی دولت کمانا، سجا سنورا، دکھانا، اترانا ہی رہ جائے۔

بطر کے ساتھ عموماً اسراف کا مرض پایا جاتا ہے۔ نعمتیں مل جانے پر آپے سے باہر ہو جانا، خوشی سے پھولے نہ سمانا (bursting with joy)، خالص مادے سے خوشی حاصل کرنے والے لوگ (materialist to the core) بطر کا شکار ہوتے ہیں۔

دکھاوے اور بطر کے فوری نقصانات:

دکھاوے میں کمیّت زندگی (living standard) تو بلند ہو جاتا ہے، لیکن معیار زندگی (quality of life) کچھ نہیں رہتا۔

اللہ تعالیٰ نے سورہ ط میں بتایا ہے کہ جو اللہ کو اس طرح بھول جائیں گے، مادہ پرستی میں لگ جائیں گے تو کیا ہوگا؟

{ وَ مَنۢ مِّنۡ اَعْرَاضٍ عَنۡ ذِکْرِیۡ فَاِنَّ لَہٗ مَعِیۡشَۃًۢ صٰنِکًا وَّ نَحۡشُہٗۡ یَومَ الۡقِیٰمَۃِ اَعۡلٰی }

(طہ: ۱۲۳)

”اور جس کسی نے میرے ذکر سے منہ پھیرا تو اُن کی معیشت تنگ ہو جائے گی اور آخرت میں اندھے اٹھائے جائیں گے۔“

اس کا نقد نقصان یہ ہوتا ہے کہ مثلاً گھر تو بہت خوبصورت ہوتا ہے مگر خاندانی نظام مضبوط نہیں رہتا، گھر ٹوٹنے لگتے ہیں، طلاقیں بڑھ جاتی ہیں، خاندان ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں، اولاد گمراہ، نافرمان اور بے راہ روی کا شکار ہو جاتی ہے۔ معاشرے سے سکون و اطمینان رخصت ہو جاتا ہے، ہر طرف بے چینی پھیل جاتی ہے۔ سامان تسکین کی بہتات ہوتی ہے مگر انسان تنہا رہ جاتا ہے، رشتے ناٹے ختم ہو جاتے ہیں۔ مکان (house) تو شاندار ہوتے ہیں لیکن وہ گھر (home) نہیں رہتے۔ پیسہ کمانے کی دوڑ میں اس قدر مصروف ہو جاتے ہیں کہ رشتوں کا تقدس قائم نہیں رہتا، نہ رشتوں کا حق ہی ادا ہو پاتا ہے، یہ دکھاوے اور بطر کے معاشرتی نقصانات ہیں۔ دکھاوے اور اتراہٹ کے تحت طرح طرح سے اپنی نمائش (show off) کی جاتی ہے،

کس کس طرح لوگوں کی توجہ اپنی چیزوں کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے، کیسے اپنی اہمیت پیسے کے ذریعے سے جتائی جاتی ہے۔ کوئی پوچھے نہ پوچھے اپنی چیزوں کی ایک ایک تفصیل، قیمت اور جگہ (out let) بتاتے ہیں۔

انسان جتنا زیادہ دکھاوا کرتا ہے اور اپنے مال و اسباب پر اترتا ہے اتنی ہی سراسیمگی (insecurity) بڑھتی جاتی ہے۔ جن چیزوں پر خرچ (invest) کرنا چاہیے وہاں لوگ نہیں کرتے اور صرف دکھاوے میں خرچ کرتے ہیں تو ایک طرح کی نقلی معیشت (bubble economy) پروان چڑھتی ہے اور پھر سب کچھ ایک دم سے ختم ہو جاتا ہے۔

دکھاوے اور بطر کا علاج:

اس کا علاج کیا ہے؟ پہلے تو بندہ اللہ سے دعا کرے جو نبی اکرم ﷺ بھی مانگا کرتے تھے:

((اللَّهُمَّ قِنِّعْنِي بِمَآزٍ قَنِّعْتَنِي وَبَارِكْ لِي فِيهِ)) (۱)

”اے اللہ تو مجھ کو مطمئن کر دے اس پر جو تو نے مجھ کو دیا اور اسی میں برکت عطا فرما

دے۔“

اس ضمن میں سورہ کہف کے مضامین پر غور کرنا بھی فائدہ دے گا کہ دنیا کی حقیقت کیا ہے؟ یہ کتنی بے وقعت شے ہے، آخرت کے مقابلے میں کتنی گھٹیا ہے۔ اس کا ایک اور علاج مہینے میں تین روزے رکھنا ہے۔ بھوک کے ذریعے اس کا علاج کیا جاسکتا ہے، جب انسان کے پیٹ میں کچھ نہیں ہوتا، بھوک کا احساس ہوتا ہے تو انسان میں نرمی اور عاجزی آتی ہے۔ ماڈی اشیاء کی طلب کم ہوتی ہے اسی لیے رمضان کا مہینہ دکھاوے اور بطر کو ختم کرنے کے لیے بہترین مہینہ ہے، اس کا ایک اور علاج یہ بھی ہے کہ انسان یہ احساس پیدا کرے کہ دنیا عارضی اور قلیل ہے اور آخرت کے مقابلے میں اس کی کوئی اہمیت نہیں بلکہ آخرت کمانے کا ذریعہ ہے۔ قرآن میں یہ بات صراحتاً موجود ہے:

{ وَمَا لَهُنَّ مِنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَوَلَعِبٌ } (العنكبوت: ۶۴)

”دنیا ہے دنیا کی زندگی مگر دھوکے کا سامان۔“

کسی کے ہیرے جو اہرات دیکھ کر بہت متاثر مت ہوں، تعریفیں نہ کریں۔ دل میں تمنا پیدا مت ہونے دیں، فوراً جنت کا تصور کر لیں۔ وہ ہے اصل مقام اور اصل ٹھکانہ!

دنیا میں مقابلہ بازی (competition) کرنا، لوگوں کی چیزوں پر بات (discuss)

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب الدعاء، باب ما يدعوه بالرجل بين الركن والمقام

کرنا بھی اس مرض کو بڑھانے کا سبب ہے۔ اگر کسی کا اچھا لباس یا اچھا گھر سجا سجا یا دیکھیں تو حسد نہ کریں، اس دوڑ میں نہ پڑیں کہ ہر اچھی شے میرے پاس بھی ہو۔ گھر آ کر تقاضے نہ کریں کہ ہمیں بھی وہی چیز چاہیے جو دوسروں کے پاس ہے۔ اگر ضرورت ہے تو ٹھیک ہے لیکن صرف نفس کو تسکین دینے کے لیے اور صرف جمع کرنے کی خاطر خریداری کرنا مناسب نہیں۔ انسان کو قناعت کی زندگی گزارنی چاہیے۔ بخاری شریف میں حدیث ہے، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((أَلَيْسَ الْعَنَىٰ عَنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ وَلَكِنَّ الْعَنَىٰ غِنَى النَّفْسِ)) (۱)

”غنی یہ نہیں کہ انسان کے پاس بے شمار چیزیں جمع ہو جائیں بلکہ اصل غنی نفس کا غنی ہو جانا ہے۔“

انسان بے نیاز ہو جائے، دنیا کی محبت دل سے نکل جائے، دنیاوی چیزوں کا ڈھیر جمع کرنے کا شوق ہی ختم ہو جائے، کوئی حرص نہ رہے، ماڈی چیزیں بے حیثیت لگنے لگیں۔ اسی طرح موت کو یاد رکھنا کہ اچانک آ کر دبوچ لیتی ہے، سب دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے، دوسروں میں بٹ جاتا ہے، اگلی دنیا میں یہ مال و متاع کچھ کام نہ آئے گا۔ ان حقائق کی یاد دہانی بھی دنیا کی محبت کو کم کرتی ہے۔

دکھاوے اور بطر کی علامات :

اپنے آپ سے یہ سوال کریں کہ آپ عام طور پر بازار کیوں جاتے ہیں؟ کسی ضرورت کے تحت جاتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ لیکن اگر شوق یا خواہشات کو پورا کرنے کے لیے جاتے ہیں یا محض بازاروں میں گھومنے پھرنے (window shopping) کے لیے، یعنی خریدنے کی سکت نہیں ہے تو دیکھ دیکھ کر ہی دل بہلا لیں۔ اگر ان وجوہات سے بازار جاتے ہیں تو یہ بطر کی علامت ہے۔

دعوتوں اور شادیوں میں جاتے ہوئے اپنا جائزہ لیجیے۔ کیا آپ کو ہر دفعہ نیا جوڑا چاہیے ہوتا ہے کیوں کہ پہلا جوڑا سب دیکھ چکے ہیں۔ یہ خیال ہمارے ہاں کا عام مرض ہے۔ ایک جوڑا اگر دو یا دو سے زائد شادیوں میں پہن لیا تو پھر اس کو دوبارہ پہننا بہت ناگوار لگتا ہے، اپنی بے عزتی محسوس ہوتی ہے۔ خاص طور پر دولہے کی والدہ، بہن اور قریبی رشتہ دار تو ضرور نئے کپڑے بنواتے ہیں، پرانے کپڑے چاہے بہت ہی قیمتی کیوں نہ ہوں انہیں دوبارہ نہیں پہنیں گے۔ خوشی کے موقع پر جب تک بہت زیادہ خرچ نہ کر لیں لگتا ہے خوشی کا حق ادا نہیں کیا، خوشی کو پیسے کے ساتھ جوڑنا

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب الغنی غنی النفس

(associate) اور غم کو بھی پیسے کے ساتھ نتھی کرنا مرض ہے۔ اب تو بعض لوگ سوئم وغیرہ بھی فائیو اسٹار ہوٹل میں کرنے لگے ہیں۔

اکثر لوگوں کو نئے کپڑے پہننے کا شوق ہوتا ہے اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن نئے کپڑے دکھاوے کے لیے نہیں سلوانے چاہئیں کہ ہر تقریب (occasion) پر اچھے بھلے کپڑے موجود ہونے کے باوجود نیا سوٹ سلوانا ہے اور وہ بھی صرف اس لیے کہ پہلا سوٹ لوگوں نے دیکھا ہوا ہے۔ جدید موبائل فون اس لیے خریدنا کہ اشتہاری بورڈ (bill board) دیکھ لیا ہے یا پھر اس لیے کہ سب دوستوں کے پاس ہے، میرے پاس کیوں نہ ہو! یہ بھی دکھاوا ہے کہ سب نے نیا ماڈل لے لیا ہے میں پرانا ماڈل کیسے استعمال کروں! لیکن اگر یہی نیا ماڈل اس لیے خریدنا ہے کہ میری ضروریات کو پورا کرتا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔

دعوتیں کیوں ہوتی ہیں؟ لوگوں کو خوش کرنا ہے، بڑی اچھی چیز ہے، اچھا جذبہ ہے لیکن اپنی خوشیاں لوگوں کو دکھانا، اپنی نعمتوں پر اترانا، اپنی شہرت کے لیے، دکھاوے کے لیے یا کسی سے کوئی کام نکلوانا ہے، اس لیے اگر دعوت کی جائے تو یہ باطل وجوہات ہیں۔ اس دعوت کا مقصد اپنی غرض حاصل کرنا ہے جو کہ پسندیدہ نہیں یا اگر دعوت اس غرض سے ہے کہ تحفے وصول کریں، شادی کی سالگرہ ہے یا بچے کی سالگرہ ہے، ایسے موقع پر لوگوں کو بلا کر تحفے تحائف وصول کرنا، یہ بھی بے غرض دعوت نہیں۔ دوست احباب کو یا پھر رشتہ داروں کو کھلانا اجرا کام ہے، لیکن یہ کام محض اللہ کی رضا کے لیے کرنا چاہیے۔

ہمارے ہاں شادیوں میں لڑکے یا لڑکی کی ماں ایک بستے (bag) میں لفافے لے لے کر جمع کرتی ہے یا پھر دلہن کے پاس ایک خاتون قلم اور نوٹ بک لے کر بیٹھی ہوتی ہے اور باقاعدہ حساب رکھا جاتا ہے کہ کس نے کتنا دیا، اسی لیے بعض لوگ اگر کسی مجبوری سے نہیں آتے تو تحفہ بھیج کر قرض چکاتے ہیں، یہ لین دین کا روبرو بن گیا ہے۔ ان باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے نزدیک صرف تحفے کی قدر (value) ہے انسان کی کوئی قدر نہیں۔ ہر دعوت میں کوئی نہ کوئی غرض ضرور ہوتی ہے۔ یہ سب بطور کا مرض ہے۔

اب اگر آپ کو کوئی تحفہ دے اور وہ کم قیمت کا ہو یا آپ کے معیار (standard) کے مطابق نہ ہو تو تحفے کی قیمت مت دیکھیں، اس کے پیچھے دینے والے کے جذبات اور نیت کو دیکھیں

اور اس کی قدر کریں، یہ بڑا اچھا مزاج ہے، تحفے کی قدر قطعاً کوئی حیثیت نہیں رکھتی، اصل چیز تحفہ دینے والے کی محبت کا اظہار ہے، اس کی قدر کریں۔

اپنا تجزیہ کریں کہ میں نعمت ملنے پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں یا آپے سے باہر ہو جاتا ہوں؟ اچھلنا کودنا، چیخنا چلانا، جھومنا شروع کر دیتا ہوں؟ یا ان نعمتوں کی وجہ سے اللہ کے آگے سجدہ ریز ہو جاتا ہوں۔

کیا میں اس طرح سوچتا ہوں کہ میرے بچے زینب مارکیٹ کے کپڑے نہیں پہن سکتے یا سکول کالج بس میں نہیں جا سکتے وغیرہ وغیرہ۔ اور اگر گفتگو کا پسندیدہ موضوع خریداری (shopping) ہو تو یہ بطر ہے۔ محبت، شہرت، عزت کا معیار صرف چیزیں جمع کرنے اور خریدنے کی استطاعت (capacity) پر ہے۔ اسی سے خوشی ملتی ہے۔ رشتہ لیتے دیتے وقت لڑکا لڑکی کا معیار پیسے والا اور تجدید پسند (modern) ہونے پر ہے تو یہ سب چیزیں بطر کا اظہار ہیں۔

ہم نے بہت ساری چیزوں کو رسم کے طور پر اپنا لیا اور ان کو اب ایک ضرورت سمجھنے لگے ہیں۔ ہر عید، بقر عید پر شادی شدہ لڑکی کا جوڑا مٹھائی سمیت جائے اور لڑکے کا جوڑا آئے۔ اسی طرح مختلف رسمیں مہندی، مایوں یا موت کی رسمیں یہ سب غیر ضروری اخراجات ہیں اور ختم ہونے چاہئیں۔ بطر کرنے والے توقعات بھی بہت زیادہ لگاتے ہیں۔ دوسروں سے امیدیں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ ایسے لوگوں سے دُور رہیں۔ شادی کے موقع پر جہیز اور بڑی کا (display) کرنا بہت بڑی رسم ہے۔ دکھاوا ہی دکھاوا ہے اور کوئی مقصد نہیں۔ بطر کرنے والے ایسے تمام دکھاووں اور نمائشوں کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ یہ سب تو خوشی کا اظہار ہے۔

راہِ عمل:

ہر قسم کی فضول رسموں اور تقریبوں سے بچنا چاہیے۔ لایعنی اور بے مقصد اخراجات بے جا نمائش دکھاوے میں شامل ہوتے ہیں۔ اپنا جائزہ لیتے رہنا چاہیے۔ دوسروں پر ہنسنا اور تنقید کرنا آسان ہے مگر اپنی خرابیوں کا اعتراف کرنا مشکل ہے۔ ان سب چیزوں کو اپنی زندگی سے نکال دیجیے۔ اللہ سے دعا کیجیے کہ اللہ شادی بیاہ کے موقعوں پر قرضوں سے بچائے۔ جو آپ کی حیثیت ہے اس کے مطابق ذمہ داریاں ادا کریں۔ لوگوں کی رضا کی خاطر اپنی جان مارنے کی ضرورت نہیں۔ آپ وہ کریں جو آپ کی استطاعت کے مطابق ہے۔ ان بے جا اخراجات کے خلاف، رسموں اور

روا جوں کے خلاف جہاد کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمارے معاشرے میں دکھاوا اور بطر ایک محاذ ہے، اس پر ڈٹ جائیں۔ دنیاوی چیزوں میں مقابلہ بازی چھوڑ کر نیکیوں کے میدان میں دوڑ لگائیے، نیکیوں میں بڑھ چڑھ کر مقابلہ کیجیے، دین و دنیا دونوں سنور جائیں گے۔

اگر اللہ نے آپ کو بہت نوازا ہے، بڑا گھر دیا ہے، روپے پیسے کی ریل پیل ہے، بڑی گاڑیاں اور نوکر چاکر ہیں، تو مزید عاجزی اور انکساری اختیار کیجیے، اپنے آپ کو حقیر سمجھئے۔ ہم اس کے بالکل قابل نہیں۔ یہ سب اللہ کا رحم و کرم ہے جو ہمیں اتنا نوازا ہے۔ کسر نفسی (humility) کے ساتھ ان نعمتوں کو استعمال کریں اور دعا کرتے رہیں کہ اے اللہ! تو میرا آسان حساب لے اور اے اللہ! ان چیزوں کی محبت میرے دل میں پیدا نہ ہو، میں اپنی وقعت، اپنا معیار اس مادی چیز کے ساتھ نہ بناؤں۔ اگر میں اللہ کی نظر میں اچھا ہوں، اللہ کا اچھا بندہ ہوں تو ہر جگہ اچھا ہوں، چاہے یہ تمام نعمتیں ہوں یا نہ ہوں۔ اللہ کا شعور کے ساتھ شکر ادا کیجیے، قرآن کا علم سب سے بڑی نعمت ہے، اگر یہ نعمت اللہ نے عطا کر دی تو ساری دنیا سے بہتر ہے۔ اس پر اللہ کا شکر ادا کریں۔ حدیث میں آتا ہے کہ ”جس شخص کو اللہ نے قرآن کی نعمت دی اور وہ اس کے علاوہ کسی اور چیز پر رشک کرے تو اس نے قرآن کی قدر نہ کی۔“

سورہ یونس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

{ قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ قَبِلْ ذَلِكَ فَلْيَفْرَحُوا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ } (آیت: ۵۸)

”اے نبی ﷺ! کہہ دیجیے جو اللہ کا فضل اور اس کی رحمت ہے تو چاہیے کہ وہ اس پر خوشیاں منائیں یہ ہر چیز سے بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں۔“

اگر خوشی کا اظہار کرنا ہی ہے تو قرآن کی نعمت پر خوشی کا اظہار کرو۔ دنیاوی نعمتوں پر خوشیاں منانا اللہ کو پسند نہیں۔ قرآن پر خوشیاں مناؤ یہ چیز اللہ کو پسند ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس دکھاوے اور بطر کے مرض سے نجات عطا فرمائے اور ہم سب کو قانع بنا دے۔

آمین یا رب العالمین!

تکبر و تذلل

تکبر کے حوالے سے بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ کوئی بھی اپنے آپ کو تکبر سے بڑی نہ سمجھے، کوئی اپنے بارے میں یہ گمان نہ رکھے کہ میں نے اپنے نفس کو ایسا پاک کر دیا ہے کہ تکبر نام کی کوئی چیز میرے اندر موجود ہو ہی نہیں سکتی۔ اسی لیے اپنے آپ کو تکبر سے پاک کرنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کیا جائے کہ ہاں مجھ میں تکبر کا پورا امکان موجود ہے۔ جب ذہن کھلا ہوا ہوگا تو ان شاء اللہ تکبر کو پہچاننے میں آسانی رہے گی۔ عام طور پر ہم دوسروں کی طرف انگلی اٹھا کر کہتے ہیں کہ وہ بہت متکبر (proud) ہے، بہت گھمنڈ والا (arrogant) ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جب ہم دوسروں پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں تو ہمیں اپنا تکبر نظر نہیں آتا۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ دوسروں کی آنکھ کا تزکا بھی نظر آجاتا ہے لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔ لہذا تکبر کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم صرف اپنے اوپر توجہ (focus) رکھیں اور تکبر کی علامات کو اپنے اندر تلاش کرنے کی کوشش کریں۔

تکبر کیا چیز ہے؟

کیمرہ دراصل دل میں ہوتا ہے، یوں سمجھیے کہ کبر کا تعلق دل کے امراض سے ہے اور اس بیماری کی علامات (symptoms) انسانی رویے میں ظاہر ہوتی ہیں۔ مثلاً تکبر میں انسان دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے۔ یہ بیماری نہایت مہلک اور خوفناک ہے، اس کے بارے میں حدیث میں آیا ہے:

((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبَرٍ))^(۱)

”جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔“

اتنی خوفناک و عید کسی اور چیز کے بارے میں نہیں آئی۔ جہاں تک غل یا کینہ آجانے کی بات ہے، اس کے بارے میں قرآن میں فرمایا گیا کہ ”اللہ دلوں کو پاک کر کے جنت میں داخل کر دے گا۔“ لیکن تکبر کے بارے میں فرمایا کہ اگر کسی کے دل میں رائی کے برابر بھی تکبر ہوگا تو وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

زمین و آسمان میں جو سب سے پہلے اللہ کی نافرمانی ہوئی اس کا سبب تکبر تھا، قرآن میں آتا ہے:

{وَاذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّا اِبٰلٰیْسَ اَبٰی وَاَسْتَكْبَرٰ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ}

(البقرہ: ۳۴)

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تحریم الکبر و بیانہ

”اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ تو وہ سب سجدے میں گر پڑے مگر شیطان، اس نے انکار کر دیا اور تکبر کیا اور ہو گیا کافروں میں سے۔“

اس پر اللہ تعالیٰ نے شیطان سے فرمایا:

{قَالَ فَاصْرَجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيمٌ ۝ وَاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلَىٰ يَوْمِ الدِّينِ ۝} (الحجر)

”تو (شیطان) نکل یہاں سے تو مردود ہے، اللہ کی رحمت سے دور ہے، اور بے شک تم پر لعنت ہے قیامت کے دن تک۔“

یعنی تو تکبر کرتا ہے، اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے۔ اللہ کا بھی فیصلہ ہے کہ اللہ تکبر کرنے والوں کو بالکل چھوٹا بنا دے گا۔ تو تکبر کی وجہ سے جب اللہ نے شیطان پر لعنت کی تو کیا وجہ ہے کہ جب انسان شیطانوں والا رویہ اختیار کریں اور تکبر کریں تو ان پر اللہ کی لعنت نہ ہو؟

سورۃ المؤمن آیت ۶۰ میں فرمایا:

{وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُوهُمْ لِكُمْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ ذٰلِخٰرِيْنًا ۝}

”اور تمہارا رب کہتا ہے مجھے پکارو میں جواب دوں گا! بے شک جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں، وہ عقرب جہنم میں داخل ہوں گے ذلیل و خوار ہو کر۔“

سورۃ احقاف میں فرمایا:

{فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ} (الاحقاف: ۲۰)

”سو آج تم کو ذلت کا عذاب ہے، یہ اس کی سزا ہے جو تم زمین میں ناحق غرور کیا کرتے تھے اور بد کرداری کرتے تھے۔“

{قِيْلَ ادْخُلُواْ اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا قَبِيْسٌ مَّشْوٰى الْهٰتِكِبْرِتِيْنَ} (الزمر: ۷۲)

”کہا جائے گا کہ دوزخ کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ ہمیشہ اس میں رہو گے پس تکبر کرنے والوں کا کتنا بڑا ٹھکانہ ہے۔“

تکبر کی شناخت اور درجات:

کوئی مہلک بیماری یکدم پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ خطرناک بیماریاں چھوٹی چھوٹی چیزوں سے ظاہر ہونا شروع ہوتی ہیں پھر کہیں جا کر وہ ایک بڑی بیماری بنتی ہیں۔ اسی طرح چونکہ تکبر بہت بڑی اور خوفناک بیماری ہے اسی لیے ہمیں دیکھنا ہوگا کہ یہ بیماری کس طرح رفتہ رفتہ اتنی بڑی خرابی بن جاتی

ہے، اس کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے، اس کا منبع (source) کیا ہے۔ اور اس سے پہلے کہ یہ چھوٹی بیماری ایک بڑی بیماری میں تبدیل ہو، کیوں نہ ہم اس چھوٹی بیماری ہی کا علاج کر لیں کیوں کہ کوئی بھی مرض آغاز میں قابل علاج ہوتا ہے لیکن جب یہ حد سے گزر جائے تو ناقابل علاج ہو جاتا ہے، جس طرح سرطان (cancer) پہلے مرحلے (first stage) سے دوسرے مرحلے (second stage) اور پھر تیسرے اور آخری مرحلے (third stage) میں داخل ہوتا ہے۔ اسی طرح تکبر کا مرض بھی مرحلہ وار (stage by stage) بڑھتا چلا جاتا ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ تکبر میں بھی ہمیں تین مرحلے (stages) ہی نظر آتے ہیں یعنی عُجْب، فخر اور پُجْر تکبر۔ ایک بات یاد رکھیں پہلے اور دوسرے مرحلے میں یہ مرض قابل علاج ہوتا ہے لیکن جب بات آخری مرحلے تک پہنچ جائے تو پُجْر یہ قابل علاج نہیں رہتا۔

واللہ اعلم۔

تکبر کا پہلا مرحلہ ”عُجْب“:

تکبر کی پہلی سیزھی کا نام ”عُجْب یا خود پسندی“ ہے۔ یہاں سے تکبر کی ابتدا ہوتی ہے، ”خود شعوری“، ”گڑ کر ”خود پسندی“ بن جاتی ہے۔ خود شعوری بجائے خدا شعوری کی راہ ہموار کرنے کے کہیں راستہ بھٹک جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں انسان اپنی ہی ذات کو خدا بنا بیٹھتا ہے۔ جب خود پسندی آتی ہے تو وہ ”انا“ جسے اللہ کے آگے سر بسجود ہونا تھا، وہ نفس کے آگے سجدہ ریز ہو جاتی ہے۔ یہ خود پسندی یا عُجْب (self conceit) تکبر کی پہلی سطح ہے۔ ایک بات یاد رکھیں خود پسندی اُسی میں آتی ہے جس میں کوئی نہ کوئی خوبی ہو۔ جب کسی انسان کے اوصاف کی تعریف کی جائے، اس کے کسی کام کو سراہا جائے تو بعض دفعہ یہ تعریف اور عزت انسان کے اندر عُجْب پیدا کر دیتی ہے۔ ایک حدیث میں ذکر ہے کہ تین چیزیں ہلاک کرنے والی ہیں۔ جن میں سے ایک عُجْب ہے۔ یہ اتنی خطرناک بیماری ہے کہ جو شخص اس میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ اپنے ہی حسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہے، اُسے اپنی ذات بہت ہی پیاری لگنے لگتی ہے۔ یہ ہے پہلا مرحلہ اور یہ قابل علاج (curable) ہے۔

عُجْب کی پہچان:

عُجْب کی معرفت اپنے خیالات کا جائزہ لینے سے ہوگی۔ اگر ہمارے تمام خیالات کا مرکز ہماری ذات ہے اور ہم اپنے ہی بارے میں ہر وقت سوچتے رہتے ہیں تو یہ عُجْب کا آغاز ہے۔ اپنے نقطہ نظر کو بہترین سمجھنا (opinionated) بھی عُجْب ہے۔ اگر ہماری گفتگو میں زیادہ تر اس طرح کے الفاظ آتے ہیں مثلاً میرا ذوق، میرے معیارات، میں کیا پہنوں، میں کیسا لگ رہا ہوں، میرا کیا

خیال ہے، کسی کے بارے میں میرا تجربہ کیا ہے، میں کسی کو دیکھ کر کیا سوچتا ہوں، تو یہ عجب کی علامات ہیں۔ اس کے علاوہ دوسروں کے بارے میں بھی یہی خیال کرنا کہ وہ میرے بارے میں سوچ رہے ہوں گے، ایسا سمجھنا کہ ہم ہی سب کے حواسوں پر چھائے رہتے ہیں، یہ رویہ بھی اسی بیماری کی نشاندہی کرتا ہے۔ ایسے افراد خود کو بہت اہم سمجھنے لگتے ہیں، اپنی ذات، اپنا خیال اور اپنی بات بہت قیمتی لگتی ہے، اپنے اوپر ناز ہونے لگتا ہے اور رفتہ رفتہ یہ احساس گفتگو میں بھی چھلکنے لگتا ہے۔ جس طرح اگر کسی برتن میں گنجانس سے زیادہ پانی بھر دیا جائے تو پھر وہ بہنے (over flow) ہونے لگتا ہے، اسی طرح اگر ذہن میں ہر وقت اپنی ہی ذات سائی رہے تو پھر اس کا اظہار ہونا فطری بات ہے۔ جب خود پسندی کا احساس اتنا زیادہ ہو جائے تو کہاں تک سنبھالا جا سکتا ہے، کب تک اندر سمٹ کر رہ سکتا ہے، کب تک صرف سوچنے پر ہی اکتفا کرتے رہیں۔ لازماً یہ خیالات اب الفاظ میں ظاہر ہوں گے، جب بھی گفتگو کریں گے تو اس میں عجب اور خود پسندی کا احساس چھلکنے لگے گا۔

دوسرا مرحلہ ”فخر“:

جب عجب گفتگو میں ظاہر ہو جائے تو یہ دوسرے مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے یعنی ”فخر“۔ عجب میں تو فقط سوچ ہی رہے تھے، مرض مخفی (dormant) تھا، اب اپنے بارے میں شیخیاں بھگاریں گے، لاف و گزاف (brag) کہیں گے، اپنی تعریفوں کے پل باندھیں گے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

{إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ} {لقمن: ۱۸}

”بے شک اللہ پسند نہیں کرتا اترانے والے خود پسند کو۔“

بہر حال فخر قابل علاج مرض ہے اگر اس مرحلے (stage) پر اس کا علاج ہو جائے تو اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ شفا مل جائے گی۔ اگر علاج نہیں کیا تو یہ مرض تیسرے مرحلے (third stage) میں داخل ہو جائے گا جو کہ لاعلاج ہے۔

تیسرا مرحلہ ”اصل تکبر“:

ابھی تک تو صرف اپنی ذات اچھی لگ رہی تھی، اُس کی تعریفیں ہو رہی تھیں، اب تکبر کا مرحلہ (phase) شروع ہوگا۔ جس میں انسان کسی کو اپنے سامنے کچھ نہیں سمجھتا۔ دوسروں کی برائیاں کرنا، بے عزتی کرنا، مذاق اڑانا، اگر کوئی ان کی بات سے اتفاق نہ کرے یا اختلاف کرے تو دشمنی پر اتر آنا، انتقامی کارروائیاں شروع کر دینا، نقصان پہنچانا۔ اس کردار کی مثالیں قرآن میں ملتی ہیں۔

مثال کے طور پر شیطان سب سے زیادہ تکبر کرنے والا تھا۔ اور انسانوں میں سب سے متکبر فرعون تھا، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو رب نہ مانا، اس کی بات کا رد کیا تو فرعون ہٹ دھرمی پر اتر آیا، مذاق اڑانے لگا، کہنے لگا (نعوذ باللہ) کہ مجھے تو یہ شخص پاگل لگتا ہے، مجھ کو تو یہ جادو گر لگتا ہے اور کتنی تحقیر کے ساتھ پوچھا تھا کہ ”رب العالمین“ کیا ہوتا ہے؟ دراصل یہ تکبر ہے۔ اپنی تعریف تو کرتا ہی تھا، کہتا تھا ”میں ہوں تمہارا رب سے اعلیٰ رب۔“ جو نہ مانے اور انکار کرے اس سے انتقام لیتا تھا اور قتل کروا دیتا تھا۔

فخر اور تکبر کی پہچان:

اب ہم فخر اور تکبر کی علامات ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔ ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ یہ مرض کہاں فخر کی حد تک ہے اور کہاں تکبر میں داخل ہو گیا۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے تکبر کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ اس کے اسباب اور اقسام بھی لکھی ہیں اور اس کا علاج بھی بتایا ہے۔ انہی کی کتاب ”کیسے سعادت“ کی روشنی میں فخر اور تکبر کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پہلے ہم دیکھتے ہیں فخر کیا ہے۔ یعنی اپنی ذات اور اس سے منسلک چیزوں پر مسرت کا اظہار کرنا۔ سب سے پہلے علم کی بات کرتے ہیں، جس کو اپنے علم پر فخر ہوگا وہ اپنے علم کا اظہار کثرت سے کرے گا کہ کہاں سے پڑھا، کتنی محنت کی، کتنے ذہین تھے اور عام لوگوں سے کتنے بلند (above average) تھے۔ اس قسم کی باتیں کر کے فخر کا اظہار کرتے ہیں، اپنی ڈگریوں کو آویزاں (display) کرتے ہیں۔ ہاں اگر کوئی ڈاکٹر اپنی ڈگری آویزاں کرتا ہے تو یہ پیشے کی ضرورت ہے۔ ہم تو اُس شخص کی بات کر رہے ہیں جو اپنی ذات سے بہت متاثر ہے اور اس کے پاس کوئی ڈگری ہے تو وہ اس ڈگری کو سوٹ کیس میں یا فائلوں میں رکھ دینا کافی نہیں سمجھتا بلکہ چاہتا ہے کہ ساری دنیا دیکھ لے۔

فخر کا مطلب ہے پھٹ پڑنا۔ فخر کا لفظ بھی انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے یعنی اندھیرے کو چیر کر آنے والی صبح۔ پھٹ پڑنے والے لوگوں میں تحمل نہیں ہوتا اپنی خوبی دوسروں کو بتانا فرض سمجھتے ہیں کہ دیکھو ہم کتنے اعلیٰ ہیں، اس طرح وہ نمائش کرتے ہیں۔ اگر بُرائی یہاں تک ہے تو قابلِ علاج ہے۔ اگر ان کو کوئی یہ احساس دلادے کہ اپنی تعریف کرنا اچھی بات نہیں، تو یہ اپنا مذاق اڑوانے کے مترادف ہے، جگ ہنسانی کا باعث ہے، تو ہو سکتا ہے وہ اپنی اصلاح کر لے۔ لیکن اگر وقت پر اس کا احساس نہ ہو تو ہو سکتا ہے کہ وقت کے ساتھ یہ چیز بڑھ کر تکبر میں بدل (convert) جائے۔ فخر کی

حد تک تو اپنی یونیورسٹی کی تعریف تھی، اپنی ڈگری کی تعریف تھی، اپنے اساتذہ کی تعریف تھی، اب تکبر یہ ہوگا کہ باقی سب کے استاد گھنٹیا، سب کی یونیورسٹیز گھنٹیا، باقی تمام سکول کالج بے کار، کسی کی کوئی ڈگری کام کی نہیں، بس انہی کے پاس جو ہے وہی بہترین ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: اس مرض کا پہلا سبب ”علم“ ہے یعنی جب کوئی صاحب علم اپنے آپ کو علم سے آراستہ پاتا ہے تو اُسے اپنے مقابلے میں دوسروں کی حیثیت و حشیوں اور جانوروں کی سی لگتی ہے۔ کبر اور نخوت اس پر غالب سے غالب تر ہوتی جاتی ہے۔ اس کی نشانی کیا ہے؟ کیسے پتہ چلے گا کہ میرے اندر تکبر ہے۔ اس کی نشانی یہ ہے کہ وہ لوگوں سے اس بات کی توقع کرنے لگتا ہے کہ وہ اس کی غیر معمولی تعظیم و تکریم کریں گے۔ اگر وہ نہ کریں تو اس کو بڑا تعجب ہوتا ہے، اُن کی عقل پر حیرت چھائی ہوتی ہے، منہ تکتے لگتا ہے کہ مجھ جیسا عالم فاضل ان کے درمیان موجود ہے اور یہ مجھے کوئی غیر معمولی اہمیت (preferential treatment) نہیں دے رہے۔ اس بات پر اس کو حیرت ہوتی ہے، بہت ہی پریشان ہوتا ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ ان لوگوں کو میری عظمت اور میرا مقام شاید معلوم نہیں ہے اگر یہ مجھ سے واقف ہوتے تو یقیناً مجھ سے امتیازی سلوک برتتے جس کا میں مستحق ہوں۔ اس طرح خود کو تسلی دے لیتا ہے کہ ان کو معلوم ہی نہیں کہ میں کون ہوں، میری قدر نہیں جانتے۔ مثال کے طور پر ایسا شخص کسی ڈاکٹر کے ہاں گیا اور وہاں کے سیکرٹری نے اُسے پچاسواں نمبر دے دیا اور کہا کہ آپ انتظار کریں۔ تو ایسا شخص یہ نمبر لے کر بہت حیران ہوگا، اس کی توقع تو یہ تھی کہ جیسے ہی میں کلینک میں داخل ہوں گا تو سب کھڑے ہو جائیں گے اور کہیں گے کہ آپ تو فلاں ہیں نا! آئیے آئیے بیٹھے، میں آپ کو سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب سے ملواؤں گا۔ وہ اس قسم کے سلوک کی توقع کرتا ہے کہ ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ ہر جگہ لوگ اس کو پہچان جائیں گے، احترام کریں گے۔ لوگ میرے آگے بچھ جائیں گے (People will bend backwards to accomodate me)، مجھے سر آنکھوں پر بٹھائیں گے اور جب ایسا نہیں ہوتا تو یہ صاحب ششدر ہ جاتے ہیں۔

آگے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ کوئی ان کو اپنے ہاں مدعو کرے تو اس کو قبول کر لے نا گویا کہ دعوت دینے والے کے سر پر ان کا احسان ہوتا ہے، دعوت دینے والے کی عزت افزائی ہوتی ہے۔

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

وہ لوگوں سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ جان لیں کہ ان کا وجود دوسروں کے لیے باعثِ برکت ہے۔ لوگ بھی تعریفیں کر کر کے دوسروں کے دماغِ آسمان پر پہنچا دیتے ہیں۔ پتہ نہیں کس کے دل میں عجب چھپا ہوا ہے، وہ عجب، عجب ہی رہ جاتا تکبر نہ بتا اگر لوگ اتنا زیادہ مسک نہ لگاتے۔ اسی لیے اسلام میں بے جا تعریف کرنا سخت ناپسندیدہ ہے، تعریف ہضم کرنا آسان نہیں، اس کا شخصیت پر منفی (negative) اثر پڑتا ہے۔ یہ اتنا بڑا فتنہ ہے کہ اس کی کوئی حد نہیں۔ ایک عربی شاعر جس کا نام ”متنبی“ تھا اس کا ایک قول آتا ہے کہ ”اگر تم کریم انسان کی عزت کرو گے وہ تمہارا احسان مند ہوگا اور اگر تم ظرف انسان (superficial) کی عزت کرو گے تو وہ باغی ہو جائے گا۔“ یعنی اس کے اندر سرکشی پیدا ہوگی اور ہو سکتا ہے کہ تکبر بھی پیدا ہو جائے۔ ہمارے ہاں ایک محاورہ استعمال ہوتا ہے ”بلکہ کو حوالہ داری مل گئی۔“ بلکہ تو تھے ہی حوالہ داری جو ملی تو وہ اپنے آپ کو نہ جانے کیا سمجھ بیٹھے۔ لہذا ایسا شخص بلانے والے کا احسان نہیں مانتا کہ اس نے مجھے اس قابل سمجھا کہ اپنے گھر بلایا، میری عزت افزائی ہوئی، بلکہ یہ سوچتا ہے کہ میں نے اس کے گھر جا کر اس پر احسان کیا ہے، بلکہ اس کا عالم شہود میں ہونا ہی دنیا پر احسان ہے ورنہ اگر وہ نہ ہوتا تو دنیا تباہ ہو چکی ہوتی۔

متکبر انسان اکثر اس بات کا بھی اظہار کرتا رہتا ہے کہ آخرت کے معاملات میں وہ حق تعالیٰ کے فضل و کرم سے بالتحقیق کامیاب ہے، جب کہ دوسرے اس فضل سے بہت دور ہیں۔ اس کی نجات تو یقینی ہے البتہ دوسروں کے لیے خطرہ اور تشویش زیادہ ہے۔ متکبر شخص کا یہ اندازِ گفتگو ہوتا ہے کہ میں تو جنتی ہوں مگر آپ کا کیا ہوگا مجھے تو آپ کی فکر کھائے جاتی ہے۔ اور یہ جتنا بھی رہتا ہے کہ ہر کوئی اس کی دعاؤں کا، ہدایت اور برکت کا سخت محتاج ہے، ورنہ دوزخ سے نجات حاصل کرنا ان کے لیے ممکن نہیں ہو سکتا۔

بعض دفعہ اللہ سے تعلق پر بھی لوگوں کو تکبر ہو جاتا ہے ان کا کہنا یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی نے ہمیں ستایا، دکھ دیا تو اللہ بدلہ لے گا۔ اور اگر کسی پر کوئی مشکل یا آزمائش آ پڑتی ہے تو فوراً فتویٰ دے دیتے ہیں کہ اللہ نے ہمارے ساتھ زیادتی کا بدلہ لیا ہے۔ ان کے تکبر کا حال یہ ہوتا ہے کہ ہم ہی اللہ کے لاڈلے ہیں، اگر کوئی ٹیڑھی نظر سے ہمیں دیکھ لے تو اللہ معاف نہیں کرے گا۔ اپنے آپ کو بزرگ اور ولی اللہ سمجھتے ہیں اور ہر ایک کو اپنا محتاج جانتے ہیں۔ ہماری صحبت میں رہ کر ہی ان کی نجات ہے۔

خاندانِ ج پر فخر و تکبر:

خاندانِ ج پر فخر اور تکبر میں بھی پہلے عجب پیدا ہوتا ہے۔ عجب کا تعلق سوچ سے ہے اور فخر کا معاملہ عمل سے ہے۔ ابتداءً اپنے بارے میں بہت سوچا اور اپنے آباؤ اجداد کے کارنامے سنے، اپنی نسل

بہت ہی اعلیٰ و ارفع لگی اور پھر اس کا اظہار بھی شروع کر دیا، اپنے خاندان کے گن گانے لگے، جب بھی گفتگو کا موقع ملا تو خاندانی تفاخر کی بات چھیڑ دی، اپنے باپ دادا کے کارنامے بیان کرنا شروع کیے، کیسے نوابوں کی اولاد تھے، کیسے مغلوں کی نسل سے تھے، کیا حسب نسب تھا، کیسے کھاتے پیتے تھے۔ ان کے آداب، رسم و رواج پر گفتگو اور شان و شوکت کا تذکرہ کیا جاتا رہا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ مرض صرف امراء تک محدود نہیں بلکہ غریب بھی اس مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایک خاتون کہہ رہی تھیں کہ میرے شوہر عام لوگوں کے خاناماں نہیں تھے بلکہ انگریزوں کے خاناماں تھے، اب بتائیے خاناماں پر بھی فخر جتایا جاتا ہے۔

ہر درجے میں فخر ہو سکتا ہے۔ انسان اپنی کسی بھی خصوصیت پر فخر کر سکتا ہے، خواہ وہ کتنی ہی غیر اہم کیوں نہ ہو۔ اپنے آباؤ اجداد کی بڑائی کبھی کبھار تو ہم سب ہی کرتے ہیں، مگر اس چیز کا اظہار بے محل، بے موقع، وقت بے وقت اچھا نہیں ہے۔ یہ سب فخر کا نتیجہ ہے، پہلے صرف ایک سوچ تھی، رفتہ رفتہ وہ زبان پر آگئی اور پھر عمل میں ظاہر ہونے لگی یعنی دوسروں کو حقیر سمجھنے لگے۔ ایسے لوگ خاندان سے باہر شادیاں نہیں کرتے، کوئی شادی خاندان سے باہر ہو جائے تو ناک کٹ جاتی ہے۔ یعنی کسی کو اپنے ہم پلہ نہیں سمجھتے تو اپنے سے نیچوں میں شادی کیوں کریں گے۔

خاندان کا تکبر اس حد تک جا پہنچتا ہے کہ نعوذ باللہ، اللہ کے ساتھ بھی تکبر کرنے لگتے ہیں۔ اللہ کے حکم کے آگے بھی کہتے ہیں کہ ہمارے لیے تو وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا، ہم اپنے باپ دادا کے رسم و رواج نہیں چھوڑ سکتے۔ اگر اللہ کے رسول یہ کہتے ہیں تو کیا ہوا، ہم تو اپنے باپ دادا ہی کی پیروی کریں گے۔ تو اللہ کی بات کو رد کر دیا جاتا ہے خاندان کی وجہ سے۔ اس تکبر کا مظاہرہ ہم اپنے معاشرے میں، اپنے ارد گرد دیکھتے ہیں اور اس کو وفاداری کہتے ہیں۔ شیطان اس طرح وفاداری اور اعتماد (confidence) کے نام پر چکر دیتا ہے۔ اور ان باتوں کے پیچھے کہیں تکبر چھپا ہوتا ہے۔ انسان شناخت نہیں کر پاتا کہ یہ تکبر ہے۔ خاندان پر تکبر کرنے والے اللہ کے سامنے بھی متکبر ہو جاتے ہیں۔ اور علم کا تکبر تو جانا پہچانا ہے کہ اگر اپنے علم کے بل بوتے پر کوئی فیصلہ کر لیا اور پھر اللہ کی کوئی بات سامنے آجائے یا اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث آگے آجائے تو کہہ دیتے ہیں کہ میرا خیال یہ ہے، میرا فیصلہ یہ ہے، میرا علم اور تجربہ یہ کہتا ہے۔ قارون نے اپنے علم پر کتنا فخر اور تکبر کیا تھا۔ جب لوگوں نے اس سے کہا تھا کہ رب کا شکر ادا کرو تو اس نے کہا: مجھے تو اپنے علم کی وجہ سے یہ مال و دولت ملی ہے، نعمتیں ملی ہیں، مقام ملا ہے تو میں کیوں کسی کا شکر ادا کروں۔

نبی اکرم ﷺ کی حدیث مبارک میں یہ بات آتی ہے کہ ”جس کو اس کے اعمال پیچھے ڈال دیں گے، اس کا حسب نسب اس کو آگے نہ بڑھا سکے گا۔“ قیامت کے دن اللہ کی نظر میں کسی خاندان کا کوئی بھی مقام یا مرتبہ نہ ہوگا۔ تو چاہیے کہ اس مرض کا علاج کریں۔ کوشش کریں کہ فخر کے مرحلے پر ہی اس مرض کا علاج کر لیں، اس سے نجات حاصل کریں تاکہ ہلاکت سے بچ جائیں۔ لیکن اگر مرض اس حد تک پہنچ گیا کہ کسی دوسرے خاندان کے فرد کو اپنے خاندان میں شامل کرنا یا اپنے خاندان کے کسی فرد کو دوسرے خاندان میں بیانا اپنی شان کے خلاف تصور کرتے ہیں تو یہ تکبر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

{إِنَّ أَكْبَرَ مَكْرَمَةً عِنْدَ اللَّهِ اتَّقَاكُمْ} (الحجرات: ۱۳)

”تم میں سے سب سے عزت والا وہ ہے جو زیادہ قتی ہے۔“

کوئی نبی کے خاندان سے بھی ہو، نبی کا بیٹا بھی ہو، لیکن اگر اس کا عمل اچھا نہیں ہے تو نبی کے خاندان کا ہونا اس کو نہ بچا سکے گا۔ قریش کے بڑے بڑے سردار تھے مثلاً ابو جہل اور ابولہب وغیرہ کیا بخش دیے جائیں گے کہ وہ بہت اعلیٰ خاندان کے تھے؟

خاندانی تکبر سے بچنے کا طریقہ:

اگر خاندان پر تکبر ہے تو پہلی کوشش یہ کریں کہ اپنے خاندان کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیں کسی کا خاندان عظیم نہیں۔ سب ایک خاندان کے ہیں، ہم سب کے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور آدم علیہ السلام مٹی سے بنے تھے اور ہم سب ایک حقیر پانی کی بوند سے بنے ہیں، تو کیوں فخر کریں اپنے آپ پر، اپنے خاندان پر۔ کیا ہم میں کوئی ایسی خوبی ہے؟ کوئی خوبی نہیں ہے۔ تو انسان اپنے آپ کو جھکائے، اپنی حیثیت کے بارے میں سوچے اور اپنے خاندان کا تذکرہ کرنا چھوڑ دے۔ کبھی کبھار برسبیل تذکرہ کوئی بات کہہ دی تو کہہ دی۔ سب ہی ذکر کر رہے ہیں تو آپ نے بھی کوئی ایک آدھ جملہ کہہ دیا تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، لیکن دوسروں کو مرعوب کرنے کے لیے، دبانے کے لیے، اپنا سکہ جمانے کے لیے اپنے آپ کو اعلیٰ ترین خاندان کا فرد بنا کر پیش کرنا نامناسب ہے، ناپسندیدہ ہے۔ خاندان پر تکبر، مردوں اور عورتوں، دونوں اصناف میں ہوتا ہے۔ عورتیں عام طور پر سسرال سے موازنہ کرتی ہیں کہ میرا میکا ایسا ہے اور میرا میکا ویسا ہے۔ یہ بھی تفاخر کی ایک صورت ہے کہ وہ سمجھتی ہیں کہ میرا میکا سب سے اعلیٰ ہے اور تمام سسرال والے لگھٹیا، کمتر اور بے کار ہیں۔

مسلمان امت پر شیطان کا ایک حملہ:

شیخ حمزہ یوسف اپنے لیکچر ”Purification of the Heart“ میں فرماتے ہیں: ”امت مسلمہ پر شیطان نے دو طرح سے حملہ کیا۔ اہل علم حضرات خصوصاً مشرقی علماء پر یہ حملہ اس

طرح ہوا کہ انہوں نے اپنے نام کے ساتھ لمبے چوڑے القابات لگانے شروع کر دیئے۔ جیسے شیخ، الحاج، مفتی اعظم وغیرہ۔ بعض دفعہ تو ان القابات کا سلسلہ اتنا طویل ہوتا ہے کہ اصل نام ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ اور مغرب کے مسلمانوں پر اس طرح سے حملہ کیا کہ عربی کے سیدھے سادے الفاظ کو صحیح تلفظ سے نہیں پڑھ سکتے، انگریزی کے مشکل سے مشکل الفاظ تو پڑھ لیں گے لیکن عبد اللہ یا عبد الرحمن نہیں کہہ سکیں گے۔“ یہ بھی ایک طرح سے تکبر کا اظہار ہے کہ کچھ حروف جو آپ صحیح طور پر بول سکتے ہیں لیکن جان بوجھ کے نہیں بولتے تاکہ آپ عام لوگوں سے نمایاں ہو جائیں، لوگوں کو یہ محسوس ہو کہ آپ یورپ کے ہیں یا یہ ظاہر ہو کہ آپ زیادہ تعلیم یافتہ ہیں۔ یہ دونوں صورتیں علم پر تکبر میں آتی ہیں جو کہ انتہائی ناپسندیدہ ہے۔ اگر کسی کی واقعی مجبوری ہے، محتاج درست نہیں ہیں، لاکھ کوشش کے باوجود ’ح‘ یا ’ق‘ ادا نہیں کر پاتے تو یہ تکبر نہیں ہے لیکن ٹھیک بولنے کی طاقت ہونے کے باوجود صحیح تلفظ کے ساتھ نہ پڑھیں کہ کہیں لوگ ہمیں سرکاری اسکول یا مدرسے سے پڑھا ہوا نہ سمجھ لیں۔ قرآن کے بجائے کُرآن بولیں، یہ بھی تکبر ہے۔ ہو سکتا ہے کچھ لوگ یہ باتیں سمجھنے سے قاصر ہوں کیوں کہ ابھی ہماری تہذیب پوری طرح مغرب کے زیر اثر نہیں آئی، لیکن شیخ حمزہ یوسف مغربی تہذیب کی بیماریوں سے بخوبی واقف ہیں کیوں کہ انہوں نے مغربی تہذیب کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دی کہ آپ ایمان لائے، موریطانیہ سے دینی تعلیم حاصل کی۔ لہذا انہیں مغربی تہذیب کو ایک صاحب ایمان کی نظر سے دیکھنے کا موقع ملا۔

ہم نے حسب نسب پر بات کرتے ہوئے سمجھا تھا کہ پہلے عجب پیدا ہوتا ہے اور پھر فخر کیا جاتا ہے اور بالآخر تکبر آجاتا ہے۔ علم پر تکبر ہو تو پھر اپنے علم کے آگے اللہ کا علم بھی کچھ نہیں لگتا معاذ اللہ۔ لوگوں کے علم کو تو پہلے ہی کچھ نہیں سمجھتے تھے اب نعوذ باللہ اللہ کے علم میں بھی نکتہ چینی کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً ہاتھ کاٹنے کی سزا وحشیانہ ہے، اسلام کے کچھ احکام آج کے دور میں ناقابل عمل ہیں اور بعض غیر ضروری ہیں۔ شیطان نے بھی اللہ تعالیٰ کے حکم پر عقلی اعتراض کیا تھا جب اُسے حکم دیا گیا آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو تو اس نے کہا، ”میں اس سے بہتر ہوں کیوں کہ میں آگ سے بنا ہوں اور وہ مٹی سے، میں کسی کتر شے کو کیوں سجدہ کروں۔“ ہو سکتا ہے کوئی شخص لوگوں کے ساتھ تکبر کا رویہ نہ رکھے مگر اللہ کے ساتھ اس کا رویہ متکبرانہ ہو۔ مثلاً جو شخص جان بوجھ کر نمازیں نہ پڑھے، اللہ کے سامنے جھکنے پر تیار نہ ہو، اس سے بڑھ کر متکبر اور کون ہوگا! جو اللہ کی بات نہیں مانتا، اللہ کے آگے سجدہ نہیں کرتا تو اس سے بڑھ کر متکبر اور کون ہوگا! جو شخص اللہ کے دیئے ہوئے احکامات کی پابندی کو لازمی اور ضروری نہیں سمجھتا اور اللہ کی دی ہوئی

شریعت پر عمل کرنا اپنی انا کے خلاف سمجھتا ہے۔ یا اسے اپنے علم پر، اپنی حیثیت پر، اپنے حسبِ نسب پر اتنا فخر ہے کہ وہ سوچتا ہے کہ نماز پڑھنے سے اس کی شان میں کمی آئے گی، یا کوئی عورت سوچے کہ میں نے حجاب اوڑھ لیا تو میں گھٹیا یا کمتر ہو جاؤں گی یا کسی تقریباً (function) میں سنگھار (make up) کر کے بیٹھی ہے اور نماز کا وقت ہو گیا تو اس لیے نماز نہیں پڑھتی کہ وضو کرنا پڑے گا اور میک اپ (make up) دھل کر اتر جائے گا۔

حسن پر فخر:

تیسری چیز جس کے بارے میں ہم بات کریں گے وہ ”حسن پر فخر“ ہے۔ یہ مرض عام طور پر خواتین میں زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس مرض کی ابتدا بھی عُجب سے ہوتی ہے۔ کسی نے رنگ کی تعریف کی، آنکھوں کی یا کسی اور جسمانی خوبصورتی کی تعریف کی تو یہ بات دل میں بس گئی اور عُجب پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ اپنے بارے میں بے حد سوچنے لگے، سب سے اہم چیز یہ بن گئی کہ میں کیسی دکھ رہی ہوں، ایسا کیا پہنوں کہ اچھی لگوں، بال کیسے بنانے چاہئیں، یوں بیٹھوں تو کیسی لگتی ہوں۔ عُجب میں انسان کو اپنے بارے میں ہی سوچتے رہنے کی عادت پڑ جاتی ہے، عورت اپنے حسن کے بارے میں ہی غور کرتی رہتی ہے اور پھر آئینہ میں خود کو دیکھ دیکھ فریفتہ ہوئے چلی جاتی ہے۔ انگریزی کی ایک کہادت ہے، "Vanity, thy name is woman" مراد یہ ہے کہ عورت تو ہے ہی فخر و تفاخر کا نام۔ یہ کسی کا ذاتی خیال نہیں ہے بلکہ سیکنڈوں سال سے یہ چیز لوگوں کے مشاہدے میں ہے کہ مردوں کی نسبت عورتوں میں فخر (vanity) زیادہ پایا جاتا ہے۔ تبھی تو ہمارے سنگھار کا سامان (vanity case) ساتھ لے کر رکھتی ہیں۔

عُجب کا ایک اظہار:

عُجب کا ایک اظہار آئینہ سے محبت ہے۔ آتے جاتے، رخ بدل بدل کر آئینہ دیکھنا، نئے کپڑے سل کر آئیں تو آئینے کے سامنے پوراسیشن (session) کرنا، وضو کرنے کھڑے ہوں تو وضو میں دھیان کم اور شیشے پر زیادہ ہونا عُجب کی علامتیں ہیں۔ ایسے شخص کا وضو مشین کی طرح غیر شعوری (automatically) طور پر ہو رہا ہوتا ہے، ساری توجہ آئینے میں نظر آنے والے سراپے پر ہوتی ہے۔ کہیں آنا جانا ہو تو بیشتر وقت اپنا جائزہ لینے میں گزار جاتا ہے۔

یہ چیز مناسب نہیں اور یہی وجہ تھی کہ پرانے وقتوں میں مائیک بیلیوں کو آئینہ کے سامنے زیادہ دیر کھڑے رہنے سے سختی سے منع کرتی تھیں، خواہ مخواہ آئینہ کے سامنے کھڑے رہنے کو برا سمجھا جاتا

تھا، کوئی بزرگ دیکھ لے تو ڈانٹ پڑتی تھی کہ کیوں آئینہ کے سامنے کھڑی ہو۔ خاندان کی بزرگ خواتین ہمیں بتاتی ہیں کہ ماؤں نے آئینے اتنے اونچے طاقتوں میں رکھے ہوتے تھے کہ ہم وہاں تک پہنچ ہی نہ پاتے اور اُچھل اُچھل کر دیکھتے تھے کہ مانگ سیدھی ہے یا نہیں۔ اگر لڑکیاں زیادہ وقت آئینے کے سامنے رہیں تو مائیں ناراض ہوا کرتی تھیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس بات کی حوصلہ افزائی (encourage) نہیں کرنا چاہیے۔ آج بھی بیٹوں اور بیٹیوں کو منع کرنا چاہیے کہ آئینے کے سامنے دیر تک کھڑے ہو کر زیب و زینت نہ کرتے رہیں۔

جن کے اندر اپنے حسن کے بارے میں عجب ہوتا ہے وہ تصویریں کھنچوانے کے بھی بہت شوقین ہوتے ہیں، اپنی تصویریں ان کو بہت اچھی لگتی ہیں۔ بڑے اہتمام سے، بن سنور کر خاص انداز (pose) بنانا کر مختلف زاویوں سے اپنی تصویریں کھنچواتے ہیں۔ شادی کی تقریبات میں خواتین کمرہ والے کو دیکھ کر مسکرانے لگتی ہیں تاکہ تصویر میں اچھی لگیں۔

بعض اوقات یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ کچھ لوگ آئینے کے سامنے تصوراتی گفتگو بھی کرتے ہیں تاکہ ان کو پتہ ہو کہ کون سا انداز ان پر زیادہ چلتا ہے تو اس کو اپنالیا جائے، ایسے لوگوں کو اپنی ذات پر نگاہ (monitor) رکھنے کی اتنی عادت ہو جاتی ہے کہ جب مجلس میں جو گفتگو ہوتے ہیں تب بھی لاشعور میں اپنے آپ کو دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ ہم ابھی بات کرتے ہوئے کیسے لگ رہے ہیں۔ حسن میں اللہ کے ساتھ تکبر کیسے ہوتا ہے۔ اگر اللہ کے کسی حکم سے اُن کا حسن چھپتا ہے یا حسن میں کمی واقع ہوتی ہے تو وہ اُس حکم پر عمل نہیں کریں گے مثلاً شرعی پردہ نہیں کریں گی، اور اگر کوئی مرد بڑا حسین ہے، اللہ نے وجاہت اور خوبصورتی سے نوازا ہے تو وہ واڈھی کی سنت پر عمل نہیں کرنا چاہے گا، واڈھی رکھی تو خوبصورتی نہیں رہے گی، شکل بگڑ جائے گی، ملاحظہ فرمائیں گے وغیرہ وغیرہ۔

صورت مورت (looks) کے بارے میں بہت محتاط (conscious) رہنا انسان کو غیر محفوظ (insecure) کر دیتا ہے، اعتماد کی کمی ہو جاتی ہے۔ ہر وقت اس فکر اور سوچ میں رہنا کہ میں دیکھنے والوں کو کیسی لگ رہی ہوں یا لگ رہا ہوں، ایک بے چینی (tension) پیدا کر دیتا ہے۔ پھر یہ عجب جو حسن پر ہوتا ہے یہ عدم تحفظ کی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے۔ ہر وقت پیارا لگنا، اچھا لگنا، یہ فکر کہ بال تو خراب نہیں ہو گئے، کہیں لپ اسٹک (lipstick) تو نہیں پھیل گئی۔ دستی بیگ (hand bag) میں بھی چھوٹا آئینہ رکھا رہتا ہے، آنکھ بچا کر اپنے آپ کو وقتاً فوقتاً موقع ملتے ہی دیکھ لیتا کہ سب ٹھیک ہے۔ یہ لوگ مجلس، محفل میں ارد گرد سے بے نیاز اپنے آپ میں مصروف رہتے ہیں، کبھی دوپٹہ ٹھیک کرتی ہیں تو کبھی بالوں کی لٹ کو سنوار رہی ہیں، کبھی گلو بند کو ہلا جلا رہے ہیں وغیرہ

غیرہ۔ دوران گفتگو انگوٹھیوں کا جائزہ لیا تاکہ قیمتی موتی لوگوں کی نظر سے اوجھل نہ ہو جائیں۔ اپنی ذات میں اس قدر مصروف رہنا بڑی ناپسندیدہ چیز ہے، یہ کوئی خوبی نہیں۔ اس عجب پر قابو پانے کی ضرورت ہے، اس کو ختم کرنے کی ضرورت ہے، بچپوں کو اس چیز سے باہر نکالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ایک خاص عمر میں یہ چیز پیدا ہوتی ہے۔ زیادہ سختی کی بھی ضرورت نہیں، ان کی خواہشات کا خیال کیجیے۔ لیکن جب وہ اس چیز کی طرف بہت زیادہ مائل نظر آئیں تو دانش مندی اور حکمت کے ساتھ ان کی حوصلہ شکنی (discourage) کریں۔

ایک زمانہ تھا کہ سرخی پاؤ ڈر، (make up) صرف شادی شدہ عورتیں کیا کرتی تھیں بلکہ یہ بناؤ سنگھار شادی شدہ عورت کی پہچان تھی، کنواری لڑکیاں ان چیزوں کا استعمال نہیں کرتی تھیں بلکہ سادہ رہتی تھیں۔ لڑکیاں گونے کنارے والے ریشمی لباس بھی نہیں پہنتی تھیں اور نہ انھیں زیور پہننے دیا جاتا تھا۔ یہ بھی تربیت کا حصہ تھا کہ لڑکیوں کو اپنی ذات پر اتنی توجہ نہیں دینی چاہیے۔ انسان اپنی ہی ذات کا اور حسن کا دیوانہ بن کر نہ رہ جائے۔ اسی وجہ سے جب شادی کے وقت لڑکی دلہن بنتی تھی تو لوگ یہی کہتے تھے کہ دلہن بن کر روپ آیا ہے۔ کیوں کہ وہ عام طور پر سادہ رہتی تھی اسی لیے دلہن بن کر نہایت خوبصورت لگتی تھی اور اس اچانک تبدیلی سے لڑکی میں حیا بھی آ جاتی تھی۔

ان چیزوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ آجکل تو کالج، یونیورسٹی کی مختلف تقریبات (functions) میں شادی شدہ عورتوں اور کنواری لڑکیوں میں فرق کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے بہت زیادہ بننے سنورنے پر ماؤں کی طرف سے حوصلہ افزائی کا رجحان اچھا نہیں، سادگی اختیار کرنی چاہیے۔ یہ سب ایک خاص عمر میں اچھا لگتا ہے۔ اگر اس بگاڑ کا سد باب نہ کیا جائے تو یہ تکبر میں بدل جائے گا۔ اس معاملے میں تکبر کا اظہار کیسے ہوگا؟ دوسروں کی صورت پر نکتہ چینی کرنا، اُن پر اعتراض کرنا، اُن کا مذاق اُڑانا، کسی کو کالا کہہ دیا، کسی کو ٹھگنا کہہ دیا، کسی کی ناک پر جملہ کس دیا، کسی کے ہونٹوں پر پٹن کر دیا۔ غرضیکہ اپنے سوا ہر ایک میں کوئی نہ کوئی عیب نظر آتا ہے۔

تکبر کی ضد: تذلل

انکساری یا تذلل (Poor self esteem) تکبر کی ضد ہے۔ ہم نے دیکھا کہ تکبر میں انسان خود کو بہت اعلیٰ و ارفع سمجھتا ہے جب کہ تذلل میں خود کو بہت گھٹیا اور ذلیل سمجھنے لگتا ہے، سارے عیب اپنے اندر نظر آنے لگتے ہیں، اپنے آپ کو بُرا بھلا کہتا رہتا ہے، سب کے سامنے اپنی برائیاں بیان کرتا ہے۔ وہ برائیاں اور وہ عیب جو چھپے ہوئے تھے، لوگوں کی نظروں سے اوجھل تھے، انہیں بھی کھول کھول کر بیان کرتا پھرتا ہے۔ تذلل میں جتنا لوگ اس بات کے لیے ذہنی طور پر تیار

رہتے ہیں کہ لوگ ان کو بُرا بھلا کہیں گے، گھٹیا سمجھیں گے بلکہ خود متوقع (expect) ہوتے ہیں کہ کب ہماری بے عزتی ہو۔ یاد رکھیں اپنی بے عزتی کرنا بھی ایک مرض ہے، بیماری ہے۔

اسلام میں عاجزی تو بہت پسندیدہ ہے لیکن اپنی بے عزتی کرنا بالکل پسندیدہ نہیں۔ کسی نے کہا ہے: "Humble yourself! do not humiliate yourself but"

اختیار کرو لیکن اپنی بے عزتی مت کرو۔" اللہ کو یہ بات پسند نہیں کہ بندہ اپنا عیب یا اپنا گناہ کسی کے سامنے ظاہر کرے جب کہ اللہ نے اس کا پردہ رکھ لیا ہو۔ لیکن کچھ لوگ دوسروں سے اپنا موازنہ کرتے رہتے ہیں اور پھر خود کو گھٹیا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، سوچتے ہیں سب مجھ سے اچھے ہیں، میں تو کسی قابل نہیں، میں تو اتنا گنہگار ہوں اور جب ان کو یقین ہو جاتا ہے کہ میں اب کبھی اچھا نہیں ہو سکتا، مجھ میں اتنی خامیاں اور خرابیاں ہیں تو اپنے آپ سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ گفتگو میں بار بار ایسے الفاظ دہراتے ہیں کہ میں یہ نہیں کر سکتا، مجھ میں اتنی قابلیت نہیں ہے، یہ کام میرے بس سے باہر ہے۔ دراصل ایسے شخص کی ذہنت شکست خوردہ ہوتی ہے، پہلے ہی اپنی بے بسی کا اعلان کر دیتا ہے، میں کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کر سکتا، گھر کا کام پورا نہیں ہو پاتا، نمازیں تقضا ہو جاتی ہیں، وقت پر کوئی کام مکمل نہیں کر پاتا۔ اتنا گنہگار ہوں اللہ کبھی نہیں بخشے گا، اللہ میری دعائیں بھی نہیں سنے گا۔ میری شکل اتنی بُری ہے، اتنی معمولی ہے۔ غرضیکہ ایک ایک برائی اور ایک ایک عیب کا اظہار کرتے ہیں۔ لوگوں سے ایک طرح سے رحم کی بھیگ مانگتے رہتے ہیں کہ میں قابلِ رحم ہوں، میرے اوپر ترس کھاؤ (They cut a sorry figure) اُن کو لوگوں کا ترس اور رحم حاصل کرنا اچھا لگتا ہے۔ اپنے غم اور دکھڑوں کی ایسی ایسی داستانیں سناتے ہیں کہ کسی طرح لوگوں کی ہمدردیاں حاصل ہو جائیں۔ اور اس طرح دوسروں کی توجہ (attention) حاصل کرتے ہیں۔ اپنے ڈھکے چھپے جھگڑے اور مسائل سب لوگوں سے بیان کرتے پھرتے ہیں۔

اگر کوئی ایسا برتاؤ (behave) کرتا ہے اور پھر اس کو اپنی عاجزی سمجھتا ہے تو یہ اس کی غلط فہمی ہے۔ یہ عاجزی نہیں ہے، یہ "تذلل" ہے، احساس کمتری کا اظہار ہے۔ تواضع کو اتنا نہیں بڑھانا چاہیے کہ وہ "تذلل" بن جائے۔ اس لیے کہ جس کے اندر اس حد تک "تذلل" ہوگا اُسے اپنی نعمتوں کا دھیان نہیں رہے گا کہ اللہ نے مجھے کتنی نعمتیں عطا کی ہیں۔ اگر نعمتوں کا احساس ہوتا تو اس کے اندر اعتماد آتا اپنی ذات کو پسند کرتا۔ لہذا تذلل کرنے والا بھی کفرانِ نعمت کا مجرم ہوتا ہے۔ بعض لوگ جان بوجھ کر تواضع کے نام پر ایسی باتیں کرتے ہیں، خود اس چیز کو پروان (cultivate) چڑھاتے ہیں۔

فرقہ ملائیت کا طرز عمل:

اسلام میں ایک ایسا دور گزار ہے جب کچھ نیک لوگوں کو اس بات کی فکر ہوئی کہ لوگ ہماری نیکیوں کی تعریف کرنے لگے ہیں۔ انھوں نے سوچا کہ ہم تو صرف اللہ کی رضائے کے لیے نیک کام کر رہے ہیں لیکن دنیا والے ہماری تعریف کر کے ہماری نیکیاں خراب کر رہے ہیں تو ایسا نہ ہو کہ ہماری ساری نیکیاں اور یہ کوششیں ریاکاری میں شامل ہو جائیں اور اللہ کے ہاں مقبولیت سے محروم ہو جائیں، تو انہوں نے ایسے کام شروع کر دیئے کہ جن سے لوگ غلط فہمی کا شکار ہو جائیں۔ مثلاً شربت ایسے پینے لگے جیسے وہ شراب ہو، ایسی حرکتیں کرنے لگے جیسے نشے میں ہیں۔ لوگوں کو ایسی غلط فہمی میں مبتلا کیا کہ ان کا کردار خراب ہے یا وہ بے حیائی کے کاموں میں ملوث ہیں۔ لوگوں کے سامنے ایسے ظاہر (pretend) کرنے لگے کہ وہ بہت گنہگار ہیں۔ اُس گروہ کا نام ”فرقہ ملائیت“ پڑ گیا تھا۔ وہ لوگوں کی ملامت چاہتے تھے کہ لوگ ملامت کریں برا بھلا کہیں۔ یہ رویہ اسلام کے ساتھ، اسلام کی تعلیمات (teachings) کے ساتھ میل نہیں کھاتا، بلکہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ مومن اپنے آپ کو رسوا اور بے عزت نہ کرے۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((لَا يَنْبَغِي لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَذُلَّ نَفْسَهُ))^(۱)

”مومن اپنے آپ کو رسوا اور ذلیل نہیں کرتا۔“

تذلل کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ انسان میں اعتماد کی کمی پیدا ہو جاتی ہے۔ نہ اس کو اپنی ذات پر اعتماد ہوتا ہے اور نہ دوسرے ہی اس پر اعتماد کرتے ہیں، ظاہری بات ہے جب آپ خود ہی اپنی اتنی برائیاں کریں گے تو بھلا کون آپ پر اعتماد کرے گا۔ اسی وجہ سے دوسرے بھی ان کو کوئی کام، کوئی ذمہ داری دینے سے کتراتے ہیں۔ کیوں کہ ایسے لوگ انتہائی احساس کمتری (inferiority complex) کا شکار ہوتے ہیں، اپنی خداداد صلاحیتوں کو نہیں پہچانتے۔ جو بھی کام شروع کرتے ہیں، نامکمل چھوڑ دیتے ہیں، اچانک بوکھلا (Panic) جاتے ہیں، ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ بعض اوقات لوگوں کے سامنے آنے سے ہچکچاتے ہیں، لوگوں کا سامنا نہیں کر پاتے، مجلسوں میں جانے سے گھبراتے ہیں، لوگوں کے سامنے کچھ بولنے کی ہمت ہی نہیں ہو پاتی کیوں کہ ان کو یقین ہوتا ہے کہ میں بہت بُرا بولتا ہوں! بولتی ہوں۔ اگر لوگ میری بات سنیں گے تو مذاق اڑائیں گے۔ میری آواز خراب ہے، میرا لہجہ بھی خراب ہے لہذا میں کسی سے بات نہیں کروں گا۔ اس کے علاوہ دوسروں کی بہت زیادہ، بے جا تعریف کرتے ہیں۔ یہ بھی تذلل کی علامت ہے۔ حسرت کے ساتھ دوسروں کی تعریف کرنا؛ متکبر شخص صرف اپنی تعریف

(۱) جامع الترمذی، کتاب الفتن۔۔۔

سننا پسند کرتا ہے مگر یہاں معاملہ برعکس ہے کہ تذلل میں مبتلا دوسروں کی بے تحاشا تعریف کرتے ہیں۔ متکبر انسان کسی کی تعریف برداشت نہیں کر سکتا اور تذلل والے اپنی تعریف نہیں سن سکتے۔ اگر کوئی تعریف کر بھی دے تو فوراً کسرِ نفسی سے کام لیں گے کہ میں اس قابل نہیں ہوں، طرح طرح کی تاویلین پیش کریں گے کہ ہم اس قابل نہیں ہیں، ہمارے اندر کوئی خوبی یا اچھائی نہیں ہے۔

تذلل کے نقصانات:

تذلل کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ انسان کی شخصیت تباہ ہو جاتی ہے، بڑی خطرناک شکل اختیار کر لیتی ہے۔ بعض دفعہ ایسے لوگوں میں تلخی آ جاتی ہے، سب کے ساتھ ترش رو ہو جاتے ہیں۔ تذلل میں مبتلا لوگ اپنے سے بڑوں میں تو ٹھیک رہتے ہیں لیکن اپنے ماتحتوں کو یا اپنے بچوں کو بہت زیادہ پوس (crush) کر رکھ دیتے ہیں۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ جس کا تعلق میری ذات سے ہے وہ بھی خراب ہی ہوگا، جن لوگوں میں یہ مرض ہوتا ہے وہ اپنے بچوں کی اٹھتے بیٹھتے برائیاں کرتے ہیں۔ میرے بچے بہت نالائق ہیں، ناک موٹی ہے، رنگ کالا ہے، چھوٹا قد ہے، بدتمیز ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایسے لوگوں سے آپ کبھی بھی اپنے گھر والوں کی تعریف نہیں سنیں گے۔ جس خرابی کا کسی کو پتہ نہیں یا کوئی عیب ہے جو کسی کو معلوم نہیں وہ بھی بھری محفل میں بیان کر دیں گے۔ یہ اپنا احساس کمتری اور تذلل اپنے ماتحتوں میں بھی منتقل کر دیتے ہیں اور اگر کبھی ان کو کوئی عہدہ (leadership) مل جائے تو اپنی ٹیم (team) کی تحریک (motivation) بالکل ختم کر دیتے ہیں۔ کبھی کسی کی تعریف نہیں کرتے بلکہ ہر بات پر تنقید کرتے ہیں۔ ان کو یہ خیال ہوتا ہے کہ جس ٹیم کا لیڈر مجھ جیسا ناکارہ انسان ہے اس کے ماتحت بھی ایسے ہی ہوں گے۔ بجائے اس کے کہ اپنی ذمہ داری کو احسن طریقے سے ادا کریں، خود اعتمادی کے ساتھ کام کریں، وہ تو اسی پر حیران رہتے ہیں کہ مجھے یہ (honour) دیا کیسے۔ اپنا یہ اعزاز ان کو بڑا عجیب اور انہونی چیز لگتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ اعزاز قبول نہیں کر پاتے۔ چنانچہ ان کی صحبت میں لوگ نکھر نہیں پاتے، کسی کی خوبی یا صلاحیت پر وہ انہیں چڑھ پاتی۔

تذلل پیدا ہونے کے اسباب:

تذلل کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے زندگی کے کسی حصے میں ان پر شدید تنقید کی گئی ہو تو جذباتی خلس (emotional scar) رہ گئی ہو، نفسیات پر گہرا اثر ہوا ہو یا کسی کے مقابلے میں ان کو حقیر سمجھا گیا ہو۔ اسی لیے والدین سے ما قبل گزارش کی گئی تھی کہ وہ اپنے بچوں میں مقابلہ (compare) نہ کریں، کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دیں۔ کسی ایک بچے کو تو بہت توجہ لاڈ پیار دینا

اور دوسرے کو بالکل نظر انداز (neglect) کر دینا بھی تذلل کا باعث ہو سکتا ہے۔ مزید یہ کہ بچوں میں سے کسی کو بد شکل اور بیوقوف ہونے کا طعنہ دیا جائے اور مسلسل یہ رویہ اور سلوک رہے تو قدرتی طور پر ایسے بچوں میں بھی احساس کمتری پیدا ہو جاتی ہے۔ تو بچوں کے سامنے کبھی بھی اُن کے کسی عیب یا خرابی کا مسلسل ذکر نہیں کرنا چاہیے، کبھی بچوں کو پاگل یا بیوقوف (stupid) نہیں کہنا چاہیے۔

عام طور پر مائیں غصہ میں ایسے الفاظ استعمال کر جاتی ہیں۔ اگر ایسا کبھی ہو جائے تو بچوں سے معافی (apologize) مانگ لیں۔ اور اللہ سے بھی استغفار کریں۔ اس کو معمول (routine) نہ بنائیں۔ بچوں کو ہر وقت بُرا بھلا کہنے سے ان کے اندر ذلت کا احساس پیدا ہوگا۔ اپنے بچوں کے سامنے ہمیشہ دوسرے بچوں کو اچھا کہیں گے کہ وہ ایسے تیز دار (well behaved) ہیں، صاف سترے رہتے ہیں، والدین کا کہنا مانتے ہیں وغیرہ وغیرہ تو یہ تذلل کا باعث بن جائے گا۔ اس لیے انتہائی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ ایک اور بات نہایت ضروری ہے کہ انسان اپنی نعمتوں پر نظر رکھے، ان کا شعوہ کر رکھے اور اپنی خوبیوں پر اپنے رب کا شکر ادا کرے، نعمتوں اور صلاحیتوں پر نظر رکھے۔ اگر اپنی نعمتوں کا احساس نہیں ہوگا تو لامحالہ تلخی پیدا ہوگی، مایوسی (depression) جنم لے گی۔

تذللُ علاج:

احساسِ ذلت کا سب سے بہترین علاج تقویٰ ہے۔ اپنے آپ کو کسی کی نظر سے دیکھنے کے بجائے صرف اللہ تعالیٰ کی نظر سے دیکھیں۔ اللہ نے فرمایا:

{الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ} (السجده: ۷)

”اللہ نے جو چیز بنائی بہت اچھی بنائی۔“

مجھے اللہ نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ میں اللہ کی تخلیق کا شاہکار ہوں۔ میں کیوں اپنے آپ کو کسی اور کی نظر سے دیکھوں۔ اپنے آپ کو کسی اور کے معیار پر کیوں جانچوں۔ لوگوں نے عقل کے خوبصورتی کے، اہلی اور کمتر کے، اچھے بُرے کے اپنے اپنے معیارات بنائے ہوئے ہیں۔ چھوٹیں ان سب کو امت دیکھیں اپنے آپ کو لوگوں کی نظروں سے! صرف اللہ کی نظر سے اپنے آپ کو دیکھیں! کیوں کہ اللہ ہی نے ہمیں بنایا ہے اور اللہ نے خود کہا ہے کہ میں نے اپنے بندوں کو بہت اچھی ساخت پر بنایا ہے۔ بے شک اللہ بہترین خالق ہے۔

{فَأَحْسَنَ صُورَكُمْ} (التغابن: ۳)

”بہت اچھی بنائی ہیں صورتیں۔“

جب اللہ اپنی بنائی ہوئی صورتوں کو اچھا کہہ رہے ہیں تو مان لیں کہ ہم بہت اچھے ہیں، اور اللہ

سے دعا کر کے اس احساس کمتری کو قابو (control) کریں، اس سے چھٹکارا حاصل کریں۔ اگر کہیں گفتگو کرنی ہے تو اچھی طرح مشق (practice) کریں اور بھرپور تیاری کے ساتھ جائیں۔ کوئی نئی چیز پکانی ہے تو بغیر کسی خوف کے پکائیں۔

تذلل کا علاج ممکن ہے۔ عموماً لوگ احساس کمتری کی گھاٹی سے نکل آتے ہیں، پھر اُن کی شخصیت نکھر جاتی ہے۔ بعض دفعہ اللہ کے فضل سے رفیق حیات ایسا مل جاتا ہے جو ان کو احساس کمتری سے نکال لیتا ہے لیکن یہ ایک بہت طویل (process) ہے۔ قدم بقدم، ایک ایک دن کر کے محنت کرنی پڑتی ہے۔

تذلل کی ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ بچپن میں اُن کو محبت نہیں ملی، ہوتی، محرومیت کا ایک احساس ہوتا ہے۔ تو جو اور پیار نہیں ملا ہوتا، تو یہ محرومیاں انسانی شخصیت (personality) پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اگر کسی انسان کو کسی رشتے سے کوئی پیار نہ ملا تو وہ سوچے کہ جس ہستی نے مجھے دنیا میں بھیجا ہے وہ تو مجھ سے پیار کرتا ہے، وہ میرا ساتھی اور مددگار ہے، اور ایسے جملے کہنا چھوڑ دے جن میں اپنی برائی ہو، اس کو بالکل فخر کی بات نہ سمجھے کہ ہم تو خود ہی اپنی برائیوں کا ذکر کرتے ہیں۔

اگر بچوں میں کوئی عیب ہے تو اس بات کو اپنے اور بچے کے درمیان رہنے دیں، ڈھنڈورا نہ پیٹیں۔ اسی طرح آپ کے ماتحت میں کوئی عیب ہے تو ماتحت اور آپ تک محدود رہنا چاہیے۔ پوری دنیا کے سامنے تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور اگر آپ میں کوئی عیب ہے تو اللہ سے رجوع کریں، اللہ سے مدد اور رہنمائی طلب کریں۔ اور جتنا بھی ممکن ہو لوگوں کے سامنے اچھی (presentable) طرح سے آئیں تاکہ لوگوں کو ہنسنے کا، مذاق اڑانے کا، برائی کرنے کا موقع نہ ملے۔ ان شاء اللہ بہتری ہوگی۔

تذلل والوں کی مدد اور علاج:

ایک خیال یہ آتا ہے کہ اگر اپنے ارد گرد ہمیں ایسا انسان نظر آئے جو احساس ذلت کا شکار ہے تو اس کی مدد کیسے کی جائے۔ اس کو بھی احساس دلایا جائے کہ اللہ نے اسے بھی اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے اور اللہ اُس سے کتنی محبت کرتا ہے۔ مذکورہ ساری تجاویز بھی اُس پر آزمائی جاسکتی ہیں۔ ایک علاج یہ بھی ہے کہ ایسے لوگ کسی ٹیم (team) کا حصہ بن جائیں۔ اس لیے کہ تذلل میں بندے کو اپنے بے کار (worthless) ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ جب یہ لوگ کسی ٹیم سے جڑ کر کام کرتے ہیں تو ان کے تذلل کا علاج ہو جاتا ہے۔ اجتماعیت (team work) میں اللہ تعالیٰ نے بڑی برکت رکھی ہے۔ اگر ایسے لوگ آپ کے ماتحت ہیں تو اُن سے ایسا کام لیں، جو نسبتاً آسان (simple tasks) ہو، ہلکا

پھلکا ہو۔ جب وہ کسی کام کو پایہ تکمیل تک پہنچادیں گے تو اُن کے اندر اعتماد آئے گا۔ ایک احساسِ تحصیل مقصد (sense of achievement) پیدا ہوگا۔ مل کر کام کرنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی کسی کام کو ادا ہو رہا ہے تو چھوڑنے کے چکر میں نہ پڑے، تو باقی افراد پکڑ لیتے ہیں اور اُس کے قدم جماتے ہیں کہ تم یہ کام چھوڑ کر نہیں جاسکتے تو مجبوراً ہی اُس کو وہ کام پورا کرنا پڑتا ہے۔ اس سے بھی اُس کے اندر اعتماد پیدا ہوتا ہے۔

اگر کسی کے اندر تذلل ہو تو اس کی تعریف کرنی چاہیے، کیوں کہ اس مرض کے علاج کے لیے تھوڑی انتہا (extreme) پر جانا ہوگا، جیسے کہ آپ کے پاس پانی ہے جو کہ بالکل خشک ٹھنڈا ہے اور آپ اس کا درجہ حرارت معتدل کرنا چاہتے ہیں تو آپ کیا کرتے ہیں، گرم پانی ڈال کر اُس کی ٹھنڈک کو متوازن یا کم کرتے ہیں اور گرم پانی کا اضافہ کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ پانی کا درجہ حرارت حسبِ ضرورت ہو جائے۔ لیکن اگر مسلسل کھولتا ہوا پانی ملتا رہیں گے تو پانی دوسری انتہا تک پہنچ جائے گا یعنی بہت گرم ہو جائے گا۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ مثال دی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ شدید بیماری کا ازالہ کرنے کے لیے بعض دفعہ دوسری انتہا پر جانا پڑتا ہے، یعنی تکبر ایک شدید مرض ہے۔ عجب کا تیسرا مرحلہ (third stage) ہے۔ تو اس کا علاج بھی دوسری انتہا پر ہوگا۔ جیسے کہ سرطان (cancer) میں کاٹ چھانٹ کرنی پڑتی ہے، صرف دوائیوں سے علاج ممکن نہیں۔ اس کے برخلاف جس کے اندر تکبر ہے وہ اپنی تعریف ہرگز نہ کرے اور نہ دوسروں سے سنے، اور کوئی دوسرا متکبر انسان کی جائز تعریف بھی نہ کرے۔ جب تک کہ تکبر اندر سے مٹ نہ جائے، دور نہ ہو جائے۔ اس کے بعد پھر معتدل رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ عام انداز میں بات چیت اور دوستانہ تعلقات قائم رکھنے چاہئیں۔ اسی طرح جس کے اندر تذلل ہے اس کے ساتھ بھی شفا یاب ہونے تک دوسری انتہا پر جانا ہوگا۔ اپنے بارے میں بہت مثبت (positive) اور اچھا اچھا سوچے، اپنے متعلق ہمیشہ اچھا گمان رکھے اور تعمیری (constructive) سوچ رکھے۔

اور تذلل میں مبتلا شخص کی خوب تعریف کرنی چاہیے، خوب حوصلہ افزائی (encourage) کرنی چاہیے تاکہ اس کے اندر خود مختاری پیدا ہو۔ اس کو توجہ (attention) دینی چاہیے، نظر انداز (ignore) بالکل بھی نہ کریں۔ اُس کی معمولی محنت اور کامیابی پر بھی دل بڑھائیں۔ اتنے عرصے تک یہ علاج جاری رکھیں جب تک وہ اعتدال پر نہ آجائے اور اپنے متعلق اچھا نہ سوچنے لگے۔ جس طرح ڈاکٹر دوائی کی مقدار مسلسل کم کرتا جاتا ہے اور صحت یاب ہونے کے بعد بالکل بند کر دیتا ہے اسی طرح تذلل میں بھی ایک اعتدال پر آ کر علاج بند کر دیا جائے تاکہ وہ اپنے آپ کو خود سنبھال لے۔ اس طرح ان شاء اللہ شفا ملے گی اور شخصیت متوازن ہو جائے گی۔

تواضع

تکبر اور تدلل دو انتہائی طرزِ عمل ہیں اور ان کے بیچ میں تواضع (humbleness) ہے۔ اعتدال پسند (modest) ہونا۔ متواضع شخصیت کو اسلام پسند کرتا ہے کیوں کہ اسلام خود بھی معتدل دین ہے۔

تواضع کی فضیلت:

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں متوازن طرزِ عمل کی مدح سرائی فرمائی ہے:

{وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَسْجُدُوْنَ عَلٰى الْاَرْضِ هٰؤُنَا} (فرقان: ۶۳)

”رحمن کے بندے تو وہ ہیں جو زمین میں دھسی چال چلتے ہیں۔“

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں آتا ہے:

((وَمَا تَوَاضَعْ أَحَدٌ لِلَّهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللَّهُ))^(۱)

”کوئی شخص اللہ کے لیے تواضع اختیار نہیں کرتا مگر یہ کہ اللہ اس کا درجہ بلند کرتا ہے۔“

مراد یہ کہ اللہ کی خاطر جو تواضع اختیار کرے گا اللہ اسے عزت دیگا۔

صحیح مسلم ہی کی ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ اللَّهَ أَوْحَىٰ إِلَيَّ أَنْ تَوَاضَعُوا حَتَّىٰ لَا يَفْخَرَ أَحَدٌ عَلٰى أَحَدٍ وَلَا يَتَبَخَّرَ أَحَدٌ عَلٰى أَحَدٍ))

أَحَدٍ))^(۲)

”اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی بھیجی ہے کہ آپس میں تواضع اختیار کرو حتیٰ کہ کوئی کسی پر فخر نہ

کرے اور نہ کوئی کسی پر زیادتی کرے۔“

یہ متوازن رویہ (balanced attitude) اسلام میں مطلوب (required) ہے۔

تواضع کی حقیقت:

تواضع دل اور روح کا فعل ہے، روح کی کیفیت کا نام ہے اور اس کا مظہر یہ ہے کہ انسان جو

(۱) صحیح مسلم، کتاب البرِّ وَالصَّلٰوةِ وَالْاَدَابِ، باب اسْتِخْبَابِ الْعَفْوِ۔۔۔

(۲) صحیح مسلم، کتاب النِّجْمَةِ وَصِفَةِ نَعِيمِهَا وَاهْلِهَا، باب الصِّفَاتِ الَّتِي يَغْزَفُ بِهَا فِي الدُّنْيَا۔۔۔

کچھ حاصل کرے اُس کا سہرا (credit) اپنے سر نہ لے بلکہ اللہ کو دے، اپنی کامیابیوں کو اللہ کی دین سمجھے۔ تو واضح یہ ہے کہ انسان اپنے بارے میں زیادہ نہ سوچے ورنہ وہ عُجب اور خود پسندی کا شکار ہو جائے گا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ اپنے آپ کو گھٹیا سمجھے، یہ بھی نہیں کرنا۔ کسی نے انکساری (modesty) کے بارے میں بہت ہی پیاری بات کہی ہے کہ:

"Modest people do not think less of themselves,
but they think about themselves less"

”متواضع لوگ اپنے آپ کو کم نہیں سمجھتے، گھنیا اور حقیر نہیں سمجھتے بلکہ اپنے بارے میں کم سوچتے ہیں۔“ یعنی اُن پر ہر وقت اپنی شخصیت کا خمار نہیں چھایا رہتا۔ یہ ہے دراصل تواضع کہ انسان اپنے بارے میں میانہ روی اختیار کرے۔

اگر کسی کو محسوس ہوتا ہے کہ لوگ اس کی عزت اور تعظیم میں غلو کر رہے ہیں، مثلاً لوگ منہ بھر بھر کر تعریفیں کر رہے ہیں یا لوگ اُس کا درجہ حد سے زیادہ بڑھا رہے ہیں، ایسی ایسی خوبیاں جوڑ رہے ہیں جو اُس میں نہیں پائی جاتیں تو اصلاح کی غرض سے اپنی کسی کمزوری کا ذکر کر دے۔ اگر ایسا کوئی واقعہ آپ کے ساتھ پیش آجائے، مثال کے طور پر کوئی آپ کے کھانا پکانے کی بہت تعریف کر رہا ہے، تو فوراً خطرے کی گھنٹی بجتی چاہیے، کہ اب میرے اندر عُجب آنے والا ہے یا اچکا۔ جب کسی محفل میں اس طرح تعریف کی جاتی ہے تو دو طرح کے خطرے ہوتے ہیں؛ اپنے اندر عُجب آنے کا اور دوسروں کے دل میں حسد پیدا ہونے کا۔ اگر کوئی اس طرح آپ کی تعریف کرے تو آپ کا رد عمل کیا ہونا چاہیے؟ اگر آپ کہیں گے کہ اللہ نے میرے ہاتھ میں ذائقہ دیا ہے تو اس پر اعتراض وارد ہوگا کہ یہ بڑی اللہ کی لاڈلی ہیں، بڑی نیک پارسا ہیں۔ بہر کیف سننے والے آپ کے بارے میں کچھ نہ کچھ منفی (negative) ہی سوچیں گے۔ لہذا کوئی بھی آپ کی تعریف کرے، آپ کی شکل و صورت کی، کپڑوں کی، آپ کے ذوق (taste) کی، کھانے پکانے کی تو ایسی صورتحال میں آپ اپنی کسی غلطی یا کمزوری کا ذکر کر سکتی ہیں۔ مثلاً خاموشی سے کہہ دیں کہ پہلے ایک دو دفعہ کوشش (try) کی تھی تو بہت بُرا پکا تھا، جل گیا تھا یا نمک تیز ہو گیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ سچی بات تو یہ ہے کہ غلطیاں سب ہی سے ہوتی ہیں تو اپنی کسی ایسی ہی غلطی کا ذکر کر دیں۔ ان شاء اللہ اس طرح لوگوں میں حسد پیدا نہیں ہوگا۔

تکبر اور تذلل کا تزکیہ :

تکبر اور تذلل دونوں عیوب ہیں۔ ان عیوب کو تزکیے سے ختم کرنا ہے۔ تزکیہ کی مثال میک اپ (make up) کی سی ہے۔ جیسے کہ چہرے کا میک اپ کر کے داغ دھبے وغیرہ چھپائے جاتے ہیں اور اس کا استعمال ایسی مہارت سے کیا جاتا ہے کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ میک اپ کیا ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ تو اضع میں ہم اپنے عیوب کو چھپانے کے بجائے ختم کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ زیادہ میک اپ (over make up) بدنما لگتا ہے اور کم میک اپ (under make up) سے عیب نہیں چھپتے اسی لیے میک اپ درمیانہ اچھا لگتا ہے۔ تو اضع بھی دو انتہاؤں کی درمیانی کیفیت ہے کہ اپنی تعریف سن کر نہ بہت اترایا جائے اور نہ ہی بہت حقیر بنا جائے کہ یہ تو سب میک اپ کا کمال ہے، میں اتنی خوب صورت کہاں ہوں، میری شکل و صورت تو بہت معمولی ہے وغیرہ وغیرہ۔

ایسی تو اضع اختیار نہ کریں کہ شخصیت مزید بدنما ہو جائے اور تو اضع شخصیت کا عیب (false modesty) بن جائے۔ آپ کو پتہ ہے کہ کھانا اچھا پکا ہے یا آپ کو پتہ ہے کہ آپ اچھی لگ رہی ہیں، تو نہ نہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ مان لیں کہ اچھا ہے اور اللہ کا شکر بجالائیں۔ ساتھ ہی اس تاثر کو زائل (tone down) کرنے کی کوشش کریں، مثلاً کوئی کھانے کی تعریف کرے تو آپ کہہ دیں کہ کبھی کبھی اچھا بن جاتا ہے اور کبھی نہیں بھی بنتا ہے۔ اس طرح آپ کی تعریف کسی کے حسد کی وجہ نہیں بنے گی۔ اور آپ بھی عجب سے محفوظ رہیں گی۔

دوسرے کی حوصلہ افزائی کے لیے اپنا ذکر کر سکتے ہیں :

اسی طرح کسی کو اپنی اصلاح کے حوالے سے مایوسی ہو رہی ہو اور وہ آپ کے سامنے اس کا ذکر کرے کہ میں تو ٹھیک ہو ہی نہیں سکتا، میں نماز کی پابندی کر ہی نہیں سکتا، فجر میں مجھ سے اٹھا ہی نہیں جاتا تو اُس کی حوصلہ افزائی (encourage) کرنے کے لیے اس طرح کی باتیں کریں کہ مجھ میں بھی یہ کمزوری تھی، اللہ کے فضل سے دور ہو گئی، آپ کوشش کرتے رہیں اور اللہ سے دعا کریں آپ کی بھی یہ خامی دور ہو جائے گی۔ اللہ نے مجھ پر فضل کیا ہے یقیناً آپ پر بھی کرے گا۔

اگر بغیر کسی وجہ کے آپ کو اپنے اندر عجب محسوس ہو رہا ہے تو اپنی کمیوں کو تباہیوں کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ اس کا جواز یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے دور خلافت میں منبر پر آئے، لوگوں سے خطاب کیا اور اپنا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ”اے عمر رضی اللہ عنہ! تو وہی ہے نا جو مکے میں بکریاں چرایا

کرتا تھا۔“ لوگ بڑے حیران ہوئے بعض نے کہا امیر المؤمنین! یہ آپ نے کیا بات کی۔ آپ تو اتنی بڑی ریاست کے امیر ہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ ایک دن میں بیٹھا ہوا تھا تو میرے دل میں خیال آیا، واہ عمر! آج تیرے پاس کتنی بڑی ریاست ہے۔ بس یہ خیال آیا تو میں نے اس کا علاج یہ سوچا کہ میں لوگوں کو بتا دوں کہ میری اصل حقیقت کیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں تقویٰ تھا تو وہ شیطانی خیال کو فوراً پہچان گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ عجب کا سانپ نقصان پہنچاتا، اژدہا بن کر ساری نیکیاں نگل جاتا، ایمان کا دشمن بنتا، اُس کا سر پکچل دیا۔ اس طرح بھی تو وضع آتی ہے۔

عجب اور تکبر سے بچنے کے اور طریقے:

اسی طرح اگر آپ کسی بڑے گھر میں رہتے ہیں اور کوئی اُس گھر کی تعریف کرے تو آپ کہہ دیں کہ ہم مدتوں فلیٹ (flat) میں رہے تھے۔ اس طرح تعریف کرنے والا بھی سمجھ جائے گا کہ یہ لوگ جدی پشتی امیر نہیں ہیں۔ لہذا عجب اور حسد دونوں کا سد باب ہو جائے گا۔ مزید یہ کہ چھوٹوں کو سلام کرنا، خواہ عمر میں چھوٹے ہوں یا رتبے میں، نوکر چاکر، کام کرنے والیاں، ان سب کو سلام میں پہل کرنے کی کوشش کریں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک متفق علیہ روایت ہے:

((أَنَّهُ مَرَّ عَلَى صَبِيَّانِ فَسَلَّمَ عَلَيْهِمَا وَقَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَفْعَلُهُ))^(۱)

”حضرت انس رضی اللہ عنہ بچوں کے پاس سے گزرے تو بچوں کو سلام کیا اور کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسا کرتے تھے۔“

اگر لباس کے حوالے سے کبر آ رہا ہے یعنی لوگ آپ کے اوڑھنے پہننے کی بہت تعریف کرنے لگے ہیں کہ آپ کی پسند (choice) بہت اچھی ہے، بہت اچھے کپڑے پہنتی ہیں، ڈیزائن (design)، بہت اچھے ہوتے ہیں، تو اس وجہ سے بھی عجب آسکتا ہے اور دوسروں میں حسد کے جذبات ابھر سکتے ہیں، تو ایسے میں تواضع اختیار کریں اور لباس میں سادگی اپنائیں۔ لیکن یاد رکھیں بات سادہ لباس کی کی گئی ہے، گندے، بدنما، بے ڈھنگے لباس کی نہیں۔ لباس خوب صورت ہو، اچھا ہو مگر بہت مہنگا نہ ہو، سادہ لباس بھی خوب صورت ہو سکتا ہے۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاِسْتِئْذَانِ، باب التَّسْلِيمِ عَلَى الصَّبِيَّانِ

تواضع کی ایک صورت:

تواضع یہ بھی ہے کہ جب لوگوں کے درمیان موجود ہوں تو کوئی نمایاں مقام حاصل کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ یعنی یہ تمنا دل میں نہ آئے کہ مجلس، محفل یا دعوت میں اپنے کپڑے دکھاؤں یا خود کو بہت اہم شخصیت بتلاؤں۔ اور نہ توجہ سے بہت زیادہ گھبرائے اور (embarrassed) ہو۔ نبی اکرم ﷺ لوگوں کے درمیان چلا کرتے تھے، آگے آگے نہیں چلتے تھے۔ نفس بہکائے گا کہ آپ تو بڑے عزت والے ہیں۔ آگے ہونے میں عزت مت محسوس کریں۔ اگر کوئی کسی کو بڑا سمجھتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگے۔ دوسروں کی رائے (opinion) کا اتنا یقین نہیں کرنا۔

سب سے مختلف (different) لگنے کی خواہش اور کوشش مت کریں۔ سب (crowd) کے ساتھ رہیں، منفرد دکھنے کی کوشش مت کریں۔ آپ کے دل میں اگر یہ خواہش ہو کہ مجھ جیسا زور مجلس میں کوئی اور نہ پہننے۔ تو اتار دیں تاکہ عجب نہ آئے یا کوئی جوڑا پہن کر یہ احساس ہو کہ ایسا تو کسی کے پاس ہوگا ہی نہیں۔ جونہی یہ احساس آئے اُس لباس کو تبدیل کر لیں، اتار دیں کچھ اور پہن لیں تاکہ عجب سے نجات ملے۔ یہ بظاہر تو سخت (extreme) اقدام ہیں لیکن یہ ناگزیر ہیں، ان پر جانا ہوگا تاکہ دل سے عجب نکل جائے، شخصیت اوسط درجے (average) پر آجائے۔ آج کل لوگ اس اوسط (average) کے لفظ سے بہت بیزار (allergic) ہیں، اس سے بڑی کوئی گالی نہیں سمجھی جاتی۔ اوسط (average) کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ جیسے باقی سب لوگ ہیں ویسا ہی میں بھی ہوں۔ لیکن ہمیں تو منفرد رہنے کا مرض ہے۔ ہمارے نفس پر یہ بات بہت گراں گزرتی ہے کہ ہمیں عام انسانوں کی صف میں لاکھڑا کر دیا جائے۔ ہمارے بچے کی کارکردگی کی رپورٹ (report card) پر اگر استاد نے اوسط (average) کا فقرہ (comment) لکھ دیا تو بچے کی شامت آجاتی ہے۔ یعنی ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہمارا بچہ اور بہت سے بچوں کی طرح ہو۔ ہم تو بے تحاشا تعریف سننا چاہتے ہیں، بہترین (best) سے کم پر راضی نہیں ہوتے۔ بے مثال (unique) ہوں اور بہترین (best) ہوں تب راضی ہوتے ہیں۔ اپنے آپ کو یہ یقین دلائیں کہ ہم متوسط (average) انسان ہیں اور متوسط ہونا کوئی خرابی یا کمی نہیں، کوئی بے عزتی کی بات نہیں۔ اپنے آپ کو اس بات پر قائل (convince) کیجیے کہ جیسے اور لوگ ہیں ویسے ہی ہم ہیں۔

اللہ کی عطا کردہ کسی نعمت کی وجہ سے یا کسی کامیابی کی وجہ سے خود کو لوگوں سے بہتر نہ سمجھیں اور نہ انسان خود کو حقیر اور گھٹیا سمجھے۔ قرآن میں اللہ فرماتا ہے۔

{وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ} (الضحیٰ: ۱۱)

”اور جو نعمت آپ ﷺ کے رب نے آپ کو دی ہے اس کو بیان کیجیے۔“

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے تلقین فرمائی ہے۔ حاصل گفتگو یہ ہے کہ شکر اور تواضع کو اپنی شخصیت کا حصہ بنائیں۔ اللہ نے جو نعمتیں دی ہیں ان کا اظہار ہونا چاہیے ان کو چھپا چھپا کر نہ رکھا جائے، جیسے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کو یہ بات اچھی لگتی ہے کہ اللہ کسی شخص کو نعمت دے تو وہ اس پر ظاہر بھی ہو، یعنی اگر کسی شخص کو اللہ نے کھاتا پیتا بنایا ہے تو اس کے بود و باش سے ظاہر ہو۔ اللہ نے صاحبِ ثروت بنایا ہے تو اچھا رہنا سہنا رکھے تاکہ ظاہر ہو کہ اللہ نے اس کو دے رکھا ہے، محتاج یا فقیر نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی رعایت کرنا کہ دکھاوا اور عجب نہ ہو، مشکل معاملہ ہے مگر قرآن و احادیث اس بارے میں ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ شکر کے طور پر نعمت کا ذکر کرنا کہ لوگ آپ کو محتاج، ضرورت مند نہ سمجھیں، بے چارہ سمجھ کر ترس نہ کھائیں تو ایسی چال ڈھال، خوراک، رہن سہن اپنانا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا فضل نظر آئے۔ لیکن کون کون سی نعمت کا ذکر کرنا ہے، کس جگہ اور کہاں ذکر کرنا ہے، یہ انسان خود ہی فیصلہ (judge) کر سکتا ہے، خود ہی تجربہ کر کے پتہ چلے گا۔

تواضع کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا ذکر کرنا ہی بندہ چھوڑ دے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((أَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ وَلَا فَخْرَ))^(۱)

”میں بنی آدم علیہم السلام کا (آدم کے بیٹوں کا) سردار ہوں اور کوئی فخر کی بات نہیں۔“

اللہ نے جو مقام دیا اُس کا اقرار، اُس کا اظہار، اُس کا شکر کہ اللہ نے دیا یہ بات عجب نہیں پیدا ہونے دے گی۔ اگر کوئی کہتا ہے کہ آپ مجھے یہ کام دے دیجیے، میرا حافظہ اچھا ہے میں یہ اچھی طرح

(۱) جامع الترمذی، کتاب المناقب، باب فی فضل النبی علیہ السلام

کروں گی یا کروں گا۔ اللہ نے مجھے اچھی یاداشت (memory) دی ہے۔ یہ تو واضح ہے یہ نعمت کا شکر ادا کرنے کا اظہار ہے تاکہ اللہ کی اس نعمت سے لوگوں کو فائدہ پہنچ سکے۔ بندہ اپنی خوبی پہچانے گا تو ہی اُس کی ذمہ داری ادا بھی کرے گا۔ اگر اپنی خوبی سے ہی بے خبر ہے تو اُس کی ذمہ داری کیسے انجام دے گا۔ اپنی خوبی کی وجہ سے، اپنی نظروں میں بلند نہیں ہونا، فخر نہیں کرنا کہ میرے اندر یہ خوبی ہے اور میں دوسروں سے اس وجہ سے بہتر ہوں۔ قابل تعریف اور قابل عزت ہوں۔ اپنی خوبی کو، اپنے وصف کو اپنا کمال نہ سمجھے، اس کو بہت سر پر سوار نہ کرے، جتنی ہے اُس کو اتنا ہی رکھے، جیسے ہم نے بات کی کہ درمیانہ (average) ہے تو درمیانہ رکھے۔

جو مقام اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو دیا، تمام انسانوں پر فضیلت دی، اس کے باوجود آپ ﷺ نے فرمایا ”میں فخر نہیں کر رہا۔ اللہ کی طرف سے دین ہے۔ اللہ پاک نے مجھ کو یہ مقام عطا کیا ہے۔“ خوبی کی وجہ سے اپنی نظروں میں خود بلند نہیں ہو جانا۔

عربی کی ایک کہات ہے کہ جولا ہے کو ایک دفعہ دور کعت نفل پڑھنے کی توفیق ہو گئی تو وحی کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ سوچا کہ اتنا اعلیٰ عمل کر لیا ہے، اتنی بڑی نیکی کر لی اب تو مجھ پر وحی نازل ہونی چاہیے۔

جیسے کہ ہم قرآن پڑھ کر الہامی خوابوں کے انتظار میں بیٹھ جاتے ہیں کہ اب خواب کے ذریعے مجھے جنت الفردوس میں میرا مقام دکھا دیا جائے گا۔ یا ہم شکوہ کرتے ہیں کہ ہمیں تو خواب ہی نہیں آتے، کچھ پتہ ہی نہیں چلتا کہ ہم کتنے اچھے مسلمان ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی کسی خوبی یا اپنے کسی عمل کو نہ اتنا بڑا سمجھیں کہ اس کو اپنے لیے طرہ امتیاز بنالیں اور نہ اتنا حقیر اور گھٹیا سمجھیں کہ اللہ کی ناشکری کرنے لگیں۔ انسان یہ سوچے کہ میں اس عنایت کا، اس چیز کا مستحق نہیں تھا، اللہ نے اپنے فضل اور کرم سے مجھ کو یہ عطا فرمایا ہے۔ اللہ مجھ سے یہ کام لینا چاہتا ہے تو میں کر رہا ہوں۔ میں اللہ کا غلام ہوں جو کام وہ مجھ سے لینا چاہے اس کام کی توفیق بھی وہی دے دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے کبھی معاشرے میں بڑا ہی باعزت مقام مل جائے ہو سکتا ہے کبھی معاشرے میں بے عزتی ہو جائے۔ قبول کر لیں۔ دونوں حالتیں اللہ کی طرف سے ہیں۔ وہ مالک ہے۔ نہ عزت پر اترانا ہے اور نہ بے عزتی پر احساسِ ذلت کا شکار ہو جانا ہے۔ دونوں کے درمیان رہنے کی ضرورت ہے۔

تکبر کا علاج:

اگر تکبر کا احساس ہو جائے تو یہ بڑا خطرناک مرض ہے، اس نے شیطان کو اپنی غلطی کا اقرار کرنے سے روک دیا اور اس میں نافرمانی کی صفت کو جنم دیا۔ فرعون کی قبولیت حق کی راہ میں آڑ بنا، یہاں تک کہ وہ حقارت پر اتر آیا، اس مرض کی نشاندہی اور علاج نہایت اہم ہے۔ جب دل میں اپنی بڑائی کا احساس ہو تو استغفار کیجئے، شعور کے ساتھ عاجزی کی دعا مانگیے۔ اگر کسی ایک شخص کو بھی آپ اپنے سے کم تر سمجھتے ہیں تو توبہ کیجئے اور اس کے لیے دعا کیجئے۔ کبھی ذہن میں خیال آئے کہ میں یہ کام فلاں سے بہتر کر سکتا ہوں تو یہ عُجْب ہے۔ فوراً استغفار کیجئے اور اس شخص کے لیے دعا کیجئے کہ اللہ اس کے درجے بلند فرمائے۔ اور نفس کشی کے لیے وہ کام کریں جن کو آپ حقیر سمجھتے ہیں۔ مثلاً اگر اپنی گاڑی پر تکبر ہے تو کبھی کبھی رکشہ میں سواری کر لیا کریں۔ ایسی جگہ جائیں جہاں آپ کے جاننے والے آپ کو دیکھیں تاکہ یہ بُت ٹوٹ جائے۔ اور اگر آپ کے بچوں میں یہ چیز ہے تو کبھی کبھار انھیں بس میں یا ٹیکسی میں سفر کروائیں، انھیں بتائیں کہ یہ چیز بہت ضروری ہے۔ بچوں کو یہ باور کروائیں کہ بسوں، رکشوں اور ٹیکسیوں میں بھی ہماری طرح کے انسان ہی سفر کرتے ہیں۔ بچے تھوڑے بڑے ہو جائیں تو انھیں عام سواریوں کے استعمال کی بھی عادت ڈالیں۔ بچوں سے اُن کا کمرہ صاف کروائیں، کچرا دان (dust bin) خالی کروائیں، جوتیاں پالش کروائیں وغیرہ۔ نعمتوں پر اترانا (flaunt) چھوڑ دیں۔ اپنی قیمتی چیزوں کی نمائش سے ہاتھ روک لیں۔ اپنی نعمتوں کا ذکر ہی مت کریں۔ اپنی تعریف اگر سنیں تو دعا کریں۔

((اللَّهُمَّ لَا تُوِّأْ أَخْذَنِي بِمَا يَقُولُونَ، وَاعْفُزْ لِي مَا لَا يَعْلَمُونَ، وَاجْعَلْنِي خَيْرًا

مِمَّا يَنْظُرُونَ))^(۱)

”اے اللہ تو میرا مواخذہ نہ کر جو یہ کہہ رہے ہیں اور مجھے بخش دے جس کا ان کو علم نہیں اور

جیسا یہ مجھ کو سمجھتے ہیں اس سے بہتر مجھ کو بنا دے۔“

تواضع حاصل کرنے کا طریقہ:

تواضع حاصل کرنے کے لیے اولاً عاجزی اور انکساری ضروری ہے۔ عاجزی دراصل دل اور روح کی کیفیت کا نام ہے، کسی خاص چال چلنے کا یا اٹھنے بیٹھنے کے انداز کا نام نہیں ہے کہ انسان جھک

(۱) شعب الایمان للبیہقی، کتاب الحج، باب حفاظ اللسان

جھک کر چلے، آہستہ آہستہ چلے یا بلاوجہ کپڑوں میں بیوند لگا لے جب کہ اچھے کپڑے موجود ہوں۔ اس کی چنداں ضرورت نہیں، یہ جھوٹی عاجزی (false modesty) کے زمرے میں آتی ہے۔ عاجزی تو دل کی کیفیت کا نام ہے کہ آپ اپنے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ اپنی ذات کے بارے میں زیادہ گفتگو مت کیجیے اور نہ دوسروں کو موقع دیں کہ وہ آپ کے بارے میں زیادہ بات کریں۔ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کو ذمہ داری سمجھیں اور انھیں دوسروں کے ساتھ باتیں۔ نعمت کے ساتھ احساس ذمہ داری بھی آجائے تو تواضع پیدا ہوتی ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((وَمَا تَوْأَضِعْ أَحْذِلْ لِلَّهِ إِلَّا زَفَعَهُ اللَّهُ))^(۱)

”جو اللہ کی خاطر تواضع اختیار کرے گا اللہ اس کو بلند فرمائے گا۔“

اللہ ہم سب کو تواضع پر قائم رہنے کی اور اسے حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور جن کا علاج ہم کر سکیں اللہ ہمیں ذریعہ بنادے کہ تکبر سے یا تذلل سے ان کو نجات دلا سکیں۔

تکبر، تذلل اور تواضع کے مثالیں:

اب آپ کو تکبر، تذلل اور تواضع کی مثالیں کچھ نکات کی صورت میں دی جا رہی ہیں۔ ان کا بہت سنجیدگی سے مطالعہ کریں، غور کریں۔ یہ نکات مرض کی نشاندہی کرنے میں بہت مددگار ثابت ہوں گے۔ مزید یہ بھی پہچاننے کے لیے کہ یہ باتیں آپ اپنے اندر محسوس کرتے ہیں؟ دوسروں کے بارے میں یہ باتیں سوچنے سے آپ کو ہنسی آئے گی مگر اپنے بارے میں سوچنے سے آپ کو ہنسی نہیں آئے گی۔

☆ مجھ میں اتنی ذہانت کہاں کہ اچھے نمبر آئیں۔ (تذلل)

☆ میں خوب صورت نہیں، مجھے محبت کرنے والا شوہر یا محبت کرنے والی بیوی نہیں ملے گی۔

(تذلل)

☆ میں نے بہترین بچے پالے، بہت اچھی تربیت کی، شوہر بھی مجھ سے راضی ہے۔ میں بہت

اچھی ساس ہوں، میری بہو مجھ سے بہت خوش ہے۔ (فخر)

☆ لوگ اپنے بچوں کے بارے میں بالکل بے پرواہ ہیں، نہ ان کی پڑھائی پر دھیان، نہ ادب

و تربیت پر۔ میری طرح کسی نے اچھے بچے نہیں پالے۔ فلاں بہت ہی ظالم ساس ہے اپنی

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والاداب، باب استعجاب العفو۔

بہو سے اتنا دل اسلوک کرتی ہے۔ (تکبر)

☆ ہم تو اللہ والے ہیں ہمارا دل دکھا کر کبھی چین نہ پائیں گے۔ (تکبر)۔

اس میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کچھ لوگ ایسے کہتے ہیں کہ ہم اللہ والوں کا دل دکھایا تو دیکھا، اللہ نے کیسی سزا دی۔ اس بارے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں اس احمق کو یہ پتہ نہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کفار نے کیسے دل دکھایا، اللہ نے ان میں سے کتنوں کو اسلام کی توفیق عطا کر دی۔ اُحد میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی شکست کا سبب بنے تھے، بعد میں اللہ نے کیسے ان کا دل کھولا۔ تو ہماری کیا حیثیت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کہ ہم اس خوش فہمی کا شکار ہو جائیں کہ اگر کسی نے میرا دل دکھایا تو سزا ملے گی۔ نعوذ باللہ۔ یہ چیز اچھی نہیں۔

☆ نیک زندگی گزارنے کے باوجود لوگوں کے سامنے ظاہر (pretend) کرنا کہ ہم تو بڑے ہی گتہ گار ہیں۔ (تذلل)

☆ لوگوں سے اپنی تعریف سن کر خوشی ہوتی ہے، اس خوشی کو بڑھنے نہیں دینا بلکہ ضبط (control) کرنے کی ضرورت ہے۔ فطری طور پر انسان خوش ہوتا ہے اپنی رائے دیتے ہوئے گھبراتا ہوں کہ لوگ بے قوف سمجھیں گے (تذلل)

☆ میں آپ کی دعوت میں ضرور آتا مگر تینوں گاڑیاں گھر میں نہیں تھیں۔ (فخر)

دوسروں کی تعریف سن کر دل چاہتا ہے کہ میری تعریف ہو۔ یہ ایک فطری خواہش تو ہے لیکن اس کو اللہ کی طرف لے جائیں کہ اللہ کے ہاں میری تعریف ہو۔ اگر آپ اس کو منحرف (deflect) کریں گے تو آپ دیکھئے گا کہ آپ لوگوں سے کتنے غنی ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ لوگ آپ کی اتنی تعریف کر ہی نہیں سکتے جو آپ سنا چاہتے ہیں۔ ہاں! اللہ کے ہاں نیک اعمال کی، صبر کی اور نیکیوں کی تعریف کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں لگا سکتا۔

☆ دوسروں کی تعریف سن کر یہ خواہش پیدا ہونا کہ لوگ میری بھی تعریف کریں (عجب) چھوٹے بچے بھی نئے کپڑے پہن کر، عید کے دن پوچھتے ہیں میں کیسا لگتا ہوں یا لگتی ہوں۔ یہ تو بچپن کی بات ہے بڑوں کو اگر یہ خواہش اور ارمان ہو تو یہ عجب ہوگا۔ اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں یوں دعا کریں کہ ”اے اللہ میں تیری نظروں میں قابل تعریف ہونا چاہتی ہوں۔“ اس طرح نیکیوں کی طرف رغبت ہوگی تاکہ اللہ کی رضا اور خوشی حاصل کی جائے اس سے بہت فرق پڑے گا۔ لوگوں

سے توقعات رکھنا بہت مایوس کن (depress) ہوتا ہے، اداس (upset) رہتے ہیں کہ لوگ تعریف کیوں نہیں کرتے تو اپنے آپ کو اس چیز سے بے نیاز کر دیں، غمی کر دیں، یہ یقیناً مشکل ہے مگر کوشش اور ساتھ ہی اللہ سے دعا کا رگر ثابت ہو سکتی ہے۔

☆ کسی دلہن کے کپڑوں پر اعتراض کرنا کہ اچھا ہے مگر کسی ڈیزائنر (designer) کا نہیں لگ رہا۔ (تکبر)

☆ میری بہو کامیکہ پنجابی ہے لیکن لوگ اچھے ہیں۔ (تکبر)

یہ ”اگر“ اور ”لیکن“ اچھا رویہ ظاہر نہیں کرتا۔ ہیں تو سندھی مگر اچھے ہیں، یعنی عموماً (generally) تو اچھے نہیں ہوتے ”مگر“ ”لیکن“ یہ اچھے مل گئے۔ یہ بہت ہی متعصبانہ ذہنیت (prejudicial mind set) کی نشاندہی کرتا ہے، ایسی باتوں سے گریز کریں۔

☆ کوئی تنقید سن کر ہمیشہ ماننے پر تیار رہنا کہ مجھ میں ضرور عیب ہوگا۔ (تذلل)

☆ اپنی غلطی پر معافی (sorry) مانگنا یا غلطی کا اعتراف کرنا مشکل لگتا ہے (تکبر)

☆ آج کل تہجد کے لیے اٹھتا ہوں تو پانی بہت ٹھنڈا ہوتا ہے (فخر)

بعض لوگ ہر چیز میں اپنے آپ کو رول ماڈل بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اچھی بیوی دیکھنی ہے تو مجھے دیکھو، اچھی بیٹی بننا ہے تو مجھ سے سیکھو۔ میں اچھی بہو بھی تھی اور ساس بھی مجھ جیسی کوئی نہیں۔ مجھ سے سبق لیکھو، میرے نقش قدم پر چلو، میری بات پلے باندھ لو کبھی نقصان نہیں اٹھاؤ گے۔

☆ وہ اپنے آپ کو پیہ نہیں کیا سمجھتی ہے۔ (تکبر)

☆ اپنی تعریف سن کر اللہ یاد آتا ہے اور اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ میرا ذاتی کمال نہیں۔ (تواضع)

☆ میں نے فلاں ڈش (dish) پکائی تھی لوگ تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے۔ (تکبر)

☆ نئی ڈشز (dishes) آزما تے ہوئے گھبرانا کہ میرے ہاتھ میں ذائقہ نہیں یا مجھ سے نہیں بن سکے گی۔ (تذلل)

☆ اپنی صلاحیتوں کو جاننے پہچاننے کی کوشش کرنا تاکہ ان کا حق ادا کر سکو۔ (تواضع)

☆ اکثر کام ادھورا چھوڑ دیتا ہوں یا ذمہ داری لیتے ہوئے گھبراتا ہوں۔ (تذلل)

☆ اتنا بڑا کام سرانجام دینا ہر کسی کے بس کا کام نہیں۔ (تکبر)

☆ گھر سجانے میں یا کپڑے سلوانے میں مجھے اپنے ذوق (taste) پر بالکل اعتماد نہیں۔
(تذلل)

☆ دینی علم نہ رکھنے والوں کو کمتر سمجھنا۔ (تکبر)

☆ کسی بھی کام کو اپنی عزت کے خلاف نہ سمجھنا۔ (تواضع)

غریب رشتہ داروں سے ملنے جانا مشکل ہو جاتا ہے۔ تمام گلیاں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ یا وہاں جا کر کپڑے سمیٹ کر بیٹھنا۔ کچھ لوگ چلے تو جاتے ہیں مگر لگتا ہے کہ سخت مشکل میں ہیں اور یوں برتاؤ (behave) کرتے ہیں جیسے بلانے والوں پر احسان کیا ہے۔

☆ کہاں بیٹھیں کوئی ڈھنگ کی بیٹھنے کی جگہ ہی نہیں۔ (تکبر)

☆ لوگوں سے گھلنے ملنے میں گھبراہٹ ہوتی ہے۔ (تذلل)

☆ اپنے بارے میں گفتگو کرنا اچھا نہیں لگتا نہ یہ پسند ہے کہ لوگ مجھے گفتگو کا موضوع بنائیں۔ (تواضع)

اب علاج یہ ہے کہ ان تمام نکات (statements) کا جواب ہاں یا نہ میں دے کر غور کریں کہ آپ کسی عارضے میں مبتلا تو نہیں۔

ریا کاری

((اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الصَّحَّةَ وَالْعَفَّةَ وَالْأَمَانَةَ وَحَسْنَ الْخُلُقِ وَالرِّضَا بِالْقَدْرِ))^(۱)

((اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الْهُدَى وَالنُّقَى وَالْعَفَافَ وَالْغِنَى))^(۲)

((اللَّهُمَّ طَهِّرْ قَلْبِي مِنَ النِّفَاقِ وَعَمَلِي مِنَ الرِّيَاءِ وَلِسَانِي مِنَ الْكُذِبِ وَعَيْنِي مِنَ الْخِيَانَةِ فَإِنَّكَ تَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورَ))^(۳)

”ریا“ کا لفظ آئی سے بنا ہے جس کے معنی دیکھنا ہیں۔ یعنی ریا کاری کا مطلب ہے یہ چاہنا کہ لوگ میرا عمل دیکھیں۔ ”سمعہ“ سماعت سے بنا ہے، مراد ہے ”سننا“، یعنی کوئی عمل یا نیکی کر کے چاہنا کہ لوگوں کو میری اچھائیوں کے بارے میں پتہ چلے۔ ریا کاری انسان کو نفاق کی طرف لے جاتی ہے، دیکھا جائے تو ریا کاری کا تعلق ”نفاق“ سے ہے اور نفاق سے بڑھ کر تو کوئی دل کا مرض ہو نہیں سکتا۔ نفاق کو سمجھنے کے لیے، ہم مزید چند موضوعات پر گفتگو کریں گے تاکہ ہم نفاق کا احاطہ (grip) کر سکیں۔ سردست ہم ریا کاری پر بات کریں گے۔

منافقوں کے بارے میں قرآن حکیم کی سورہ نساء میں ذکر ملتا ہے:

{وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كَسَالَى يُرَآءُونَ النَّاسَ وَلَا يُدْرِكُونَ اللَّهَ الْأَقْلِينَ} (النساء: ۱۴۳)

”جب یہ منافق نماز کی طرف آتے ہیں تو بہت سستی کے ساتھ آتے ہیں، صرف لوگوں کو دکھانے کو اور اللہ کو یاد ہی نہیں کرتے مگر بہت کم۔“

اس آیت میں ان کی نمازوں کا حال بیان ہوا ہے کہ وہ اللہ کی محبت میں نماز نہیں پڑھتے۔ اگر ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو ہرگز نماز نہ پڑھیں گے، کیوں کہ یہ لوگوں کو دکھانے کے لیے نماز پڑھتے ہیں، تاکہ لوگ ان سے مرعوب ہوں اور صاحب ایمان سمجھیں۔ اس ضمن میں سورہ ماعون میں بہت سخت آیات نازل ہوئی ہیں:

{الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ الَّذِينَ هُمْ يُرَآءُونَ} (الماعون: ۶، ۵)

(۱) شعب الایمان للبیہقی، کتاب حسن الخلق، فصل فی الحلم والتؤدق۔۔۔

(۲) صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب التضرع ذم شرف ما عمل۔۔۔

(۳) کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال، کتاب الدعاء، الفصل السادس جوامع الأدعية۔۔۔

”جنہم میں جانے والے وہ ہیں) جو اپنی نمازوں سے غفلت برتتے ہیں۔ وہ لوگ جو دکھاوا کرتے ہیں۔“

اس مقام پر بھی نماز میں ریا کاری کا ذکر آیا کہ اُن کے دل نماز نہیں پڑھنا چاہتے مگر دکھاوے کے لیے کچھ نہ کچھ عمل کر لیتے ہیں۔ البتہ اُن کی عبادات کے پیچھے اللہ کی محبت کا جذبہ کارفرمانہیں ہوتا۔

ابن ماجہ میں حدیث مبارکہ ہے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ يَسِيرَ الرِّيَاءِ شَرُّكَ))^(۱)

”بے شک تھوڑی سی ریا بھی شرک ہے۔“

مسند احمد میں حدیث مبارکہ ہے:

((مَنْ صَلَّى يُرَائِي فَقَدْ أَشْرَكَ وَمَنْ صَامَ يُرَائِي فَقَدْ أَشْرَكَ وَمَنْ تَصَدَّقَ

يُرَائِي فَقَدْ أَشْرَكَ))^(۲)

”جس نے دکھاوے کی نماز پڑھی وہ تو شرک کر چکا، اور جس نے دکھاوے کا روزہ رکھا وہ

شرک کر چکا اور جس نے دکھاوے کی خیرات دی، دکھاوے کا صدقہ کیا، وہ تو شرک کر چکا۔“

اس کے علاوہ نبی اکرم ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

((إِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمْ الشُّرُوكَ الْأَصْغَرَ قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ وَمَا

الشُّرُوكَ الْأَصْغَرَ قَالَ الرِّيَاءُ))^(۳)

”(اے مسلمانو!) مجھے تمہارے بارے میں جس چیز کا سب سے زیادہ خوف ہے وہ شرک

اصغر ہے۔ لوگوں نے دریافت کیا شرک اصغر کیا ہوتا ہے اے اللہ کے رسول ﷺ؟ آپ نے

فرمایا ”ریا کرنا“ یعنی دکھاوا کرنا۔

سَمْعَهُ :

اب اس لفظ ”سمعه“ کو اچھی طرح پہچان لیجیے۔ اس میں انسان کی نیت، اس کا ارادہ، اس کا

مطلوب، اُس کی چاہت یہ ہوتی ہے کہ لوگوں میں اس کی شہرت ہو۔ تاکہ اُس کو ذاتی بڑائی

(celebrity status) اور اہمیت مل سکے، لوگ اس کو پہچاننے لگیں، لوگوں میں اُس کا ذکر ہو،

یعنی اپنی ذاتی عظمت کے چرچے سننے کا شوق ہوتا ہے اور ذاتی تعریف کی طلب ہوتی ہے۔ وہ تمام

(۱) مسنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب مَنْ تَرَجَّى لَهُ السَّلَامَةُ مِنَ الْفِتَنِ

(۲) مسند احمد، مسند الشاميين، حدیث شداد بن اوس رضی اللہ عنہ

(۳) مسند احمد، مسند الانصار، حدیث محمود بن لبید رضی اللہ عنہ

اعمال بس یہی سننے کو کرتا ہے کہ اس شخص کا تو بڑا چرچا ہے، ہر محفل میں اس کا ذکر ہوتا ہے، اس کو کون نہیں جانتا وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک ریاکاری کا تعلق ہے، اس میں لوگ ہر کام دوسروں کو دکھانے کے لیے کرتے ہیں۔ ان کی نیت اور مطلوب یہ بات ہوتی ہے کہ لوگ ان کو عبادت کرتے ہوئے دیکھیں، ان سے مرعوب ہوں اور ان کو متقی اور پارسا سمجھیں اور انکے گردیدہ ہو جائیں۔ یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی عبادت کا، اپنی نیکیوں کا اور دین کے راستے میں جو بھی محنت کی ہوتی ہے اس کا نقد صلہ دنیا میں چاہتے ہیں۔ ان کا ارادہ و نیت محض دنیا کی طلب ہوتا ہے۔ اس بارے میں بخاری اور مسلم میں حدیث مبارکہ موجود ہے۔ حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ سَمِعَ سَمِعَ اللَّهُ بِهِ))^(۱)

”جو سنانے کے لیے کام کرے گا، اللہ اس کو سنو ادے گا۔“

یعنی جس کو اپنی تعریف سننے کا شوق ہوگا، اللہ اس کا شوق پورا کر دے گا، خوب واہ واہ ہوگی۔ اور جو دکھاوے کے لیے کام کرے گا، اللہ اُس کے اعمال کو دنیا پر ظاہر کر دے گا، اُس کی یہ تمنا، یہ خواہش، یہ طلب پوری کر دے گا۔ لیکن پھر سوچ لے کہ آخرت میں اس کا کیا انجام ہوگا۔ اگر سب کچھ یہاں لوگوں میں لٹا دیا، لوگوں کی تعریف سمیٹنے میں خرچ کر دیا تو اللہ کے ہاں فروخت کرنے کو کچھ نہ بچے گا، تہی دست و تہی دامن ہی ہوگا۔ یہی اس حدیث کا مطلب ہے کہ اگر کوئی شخص نیک اعمال محض شہرت کی خاطر کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو شہرت دیدے گا۔

ریا کاری کی نشانیاں:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ریا کاری تین نمایاں نشانیاں ہوتی ہیں۔ (Three

prominent characteristics) (1) تنہائی میں ست اور لوگوں کے درمیان چست رہتا ہے۔ مثلاً جب خلوت میں ہوتا ہے تو نماز پڑھنے کا دل نہیں چاہتا، بلکہ پڑھتا ہی نہیں لیکن جب لوگوں میں ہوتا ہے تو عبادت میں خوب تیزی دکھائے گا۔ (2) لوگوں سے مسکرا کر ملتا ہے، تاکہ لوگ اُس کی وجاہت سے متاثر ہوں، جب لوگ اُس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اس کی دلی تمنا پوری ہو رہی ہوتی ہے اس لیے بہت خوش ہوتا ہے۔ (3) تیسری پہچان یہ ہے کہ اپنی تعریف سن کر زیادہ عمل کرتا ہے۔ اگر وہ اپنی تعریف سنے، کوئی واہ واہ کرے تو زیادہ عمل کرتا ہے، یا تنقید سن کر عمل کم کر دیتا ہے۔ مثلاً

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب الریاء والسمعة

کسی نے کہا آپ حجاب پہن کر بہت پیاری (graceful) لگتی ہیں تو پہننا شروع کر دیا اور اگر کسی نے کہہ دیا کہ آپ حجاب پہن کر بالکل مائی لگتی ہیں، عمر زیادہ لگتی ہے تو اُتار پھینکا۔ ان مثالوں کو، ان چیزوں کو خود پر اطلاق (relate) کرنے کی کوشش کریں۔ اسی طرح اگر کسی نے ہمارے قرآن پڑھنے پڑھانے کی تعریف کی تو جوش و خروش سے مزید پڑھنا پڑھانا شروع کر دیا۔ اور اگر کسی نے کہہ دیا کہ تم وقت (time) ضائع کر رہے ہو تو بدل ہو کر چھوڑ دیا۔ یہ ریا کاری کی علامات ہیں۔

یاد رکھیں قرآن کے طالب علم نے ترجمہ یاد کیا، نمبر بہت اچھے آئے تو خوب شوق سے اگلے امتحان (test) کی تیاریاں شروع کر دیں، اور اگر فیل ہو گیا یا خراب نمبر آئے تو دل بار دیا، سب چھوڑ کر بیٹھ گیا۔ یہ علامات اُس شخص کی ہیں جو دوسروں کو دکھانے کے لیے عمل کرتا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ جو دوسروں کی تعریف و تنقید کی بنیاد پر فیصلہ کرے وہ پھر اللہ کی خاطر تو کام نہیں کر رہا۔ وہ تو اپنے نفس کی خاطر، اپنی تعریف سننے آیا ہے۔ جب تک تعریفیں ہوتی رہیں گی اللہ کے لیے کام کرتا رہے گا۔ جب تنقید ہوگی، حالات ناگوار ہوں گے، وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔

{يَتَقَلَّبُ عَلَى عَقَبِيَّهِ} (البقرة: ۱۴۳)

”اپنی ایزدھیوں پر گھوم جائے گا۔“

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ بیچ محفل میں غمزہ شکل بنا کر، گردن جھکائے بیٹھا ہے، بہت پریشان اور افسردہ چہرہ بنایا ہوا ہے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے بیڑھی گردن والے، اس گردن کو سیدھا کر لے۔ خشوع کا مقام دل ہے نہ کہ گردن۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ تربیت کا اتنا خیال رکھتے تھے ورنہ کیا ضرورت تھی کسی کو ٹوکنے کی، یہ بھی سوچ سکتے تھے کہ بُرا مان جائے گا۔ لیکن وہ استاد کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ اُن کی ذمہ داری تھی کہ اُمت کی اصلاح کا خیال رکھیں۔ وہ خلیفہ وقت تھے۔ ظاہر اور باطن دونوں کی حفاظت کرنا، انہوں نے اپنی ذمہ داری سمجھا ہوا تھا۔ لہذا ریا کاری کی چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی برداشت نہیں کرتے تھے، ایسا نہ ہو یہ چیز اس کو آخرت میں لے ڈوبے۔

ہر ریا کار ادا کار ہوتا ہے۔ ادا کاری (acting) کر رہا ہوتا ہے، نیک بننے کا ڈھونگ رچا رہا ہوتا ہے۔ لوگوں کے سامنے ظاہر (pretend) کرتا ہے کہ میرے دل میں بہت تقویٰ ہے، حالانکہ ہوتا نہیں ہے، دل اللہ کی محبت سے خالی اور مخلوق میں مشغول ہوتا ہے۔ مخلوق کی عظمت ہوتی ہے، خالق کی فکر سے خالی اور مخلوق کے ساتھ مشغول۔ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ”جب کوئی ریا

کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وہ دیکھو میرا یہ بندہ کس طرح میرا ہی مذاق اڑا رہا ہے۔“ تو ریا کاری انتہائی خوفناک چیز ہے۔ اس سے حتیٰ الامکان بچنے کی ضرورت ہے۔

ریا کاری کے مختلف انداز:

مختلف طریقوں سے لوگ ریا کاری کرتے ہیں۔ کبھی جسم سے اظہار کرتے ہیں، کبھی لباس سے، کبھی گفتگو سے۔ جسم سے ریا کاری کا اظہار دو طرح سے ہوتا ہے۔ ایک جھوٹی ریا کاری اور دوسری محض ریا کاری۔ مثال کے طور پر رمضان ہے روزہ نہیں رکھا لیکن لوگوں کے سامنے شکل ایسی بنائی جیسے روزے سے ہیں۔ یہ ریا کاری ہے اور جھوٹ بھی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ نقلی روزہ رکھا اور شکل صورت ایسی بنائی کہ دیکھنے والا سمجھ جائے کہ یہ شخص روزے سے ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ”کیمیائے سعادت“ میں تفصیل کے ساتھ ریا کا ذکر کیا ہے۔ فرمایا ہونٹوں کو اتار کر نہ کہ ان پر پڑیاں جم جائیں، ہونٹ خشک ہو جائیں، کچھ کہنے کی ضرورت نہ پیش آئے، خود ہی لوگ سمجھ جائیں کہ ان کا روزہ ہے۔ یا بیٹھے بیٹھے اپنے اوپر غنودگی طاری کرنا، تاکہ سب سمجھیں کہ بڑے شب بیداری کرنے والے ہیں۔ راتوں کو جاگتے ہیں، تہجد میں اٹھتے ہیں تبھی تو نیند کے جھونکے آ رہے ہیں۔ یہ جسم کی ریا کاری ہے۔

خرچ کرنے میں ریا کاری:

خرچ کرنے میں ریا کاری یہ ہے کہ اللہ کے نام پر جو دیں گے دکھا کر دیں گے۔ چیک (cheque) دیا تو سب کے سامنے دیا اور میڈیا کو بھی بلا لیا تاکہ تصویریں چھپ جائیں یا براہ راست (live coverage) چینل پر آجائے۔ ایسی تصویریں ہم روز اخباروں اور TV پر دیکھتے رہتے ہیں۔ یتیم خانے میں، ہسپتال میں یا اسکول میں عطیہ (donation) دیا تو وہاں اپنے نام کی تختی (plate) ضرور لگوائی تاکہ لوگوں کو پتہ چلے کہ فلاں صاحب نے اتنا عطیہ (donation) دیا ہے۔ ان تمام نیک کاموں کے پیچھے اگر دکھاوے کا جذبہ کارفرما ہے تو پھر یہ ریا کاری ہے۔ البتہ اگر کسی کی محبت میں، قلبی تعلق کی وجہ سے، اُس کی تعظیم میں نام رکھ رہے ہیں، ریا کاری مقصود نہیں ہے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن اپنے نام پر کہیں اسکول یا ہسپتال یا ڈسپنسری وغیرہ کھلوانا کہ پتہ چلے کہ میں نے یہ کام کیا ہے میرا نام مشہور ہو، یہ ریا کاری ہے۔

لباس میں ریا کاری:

لباس میں ریا کاری یہ ہے کہ وسعت کے باوجود انتہائی حقیر اور معمولی لباس پہننا کہ لوگ

سمجھیں کہ بہت اللہ والے ہیں، زاہد ہیں، پرہیزگار ہیں، دنیا سے بے نیاز ہیں۔ اس معاملے میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے جس باریک بینی سے کام لیا ہے، اللہ تعالیٰ اُن کو اس کا اجر دے۔ وہ لکھتے ہیں کہ کچھ لوگ ہمارے زمانے میں ایسے ہیں کہ ان کا آنا جانا عوام میں بھی ہے اور بادشاہوں میں بھی ہے۔ اب وہ بادشاہوں کی نظروں میں بھی چننا چاہتے ہیں اور عوام میں بھی اپنے زہد کا بھرم رکھنا چاہتے ہیں۔ تو کیسا لباس پہنیں؟ اگر اعلیٰ لباس پہنیں گے تو عوام کی نظروں سے گریں گے اور اگر معمولی لباس پہنیں گے تو بادشاہوں کی نظروں میں باحیثیت نہیں رہ پائیں گے۔ تو وہ قیمتی مگر سادہ لباس پہنتے ہیں کہ عوام جب دیکھیں تو پہچان نہ پائیں کہ کتنا قیمتی ہے، ظاہری سادگی سے دھوکہ کھا جائیں اور بادشاہ اس لباس کی قدر پہچان جائیں اور جان لیں کہ لباس بہت قیمتی ہے۔ اس طرح یہ ریاکار لوگ دونوں طبقات کے منظور نظر رہتے ہیں، محل میں بھی قابل قبول اور عوام الناس بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ غرباء ان کی سادگی دیکھ کر زاہد سمجھتے ہیں اور امراء لباس دیکھ کر اپنی نگر اور پلے کے سمجھتے ہیں۔ یہ ہے لباس کی ریاکاری۔

گناہوں پر افسوس کرنے میں ریاکاری:

باتوں میں ریاکاری کرنا بھی ایک مہلک کام ہے، دل دکھنے کی وجہ سے۔ تقویٰ کی وجہ سے نہیں بلکہ اداکاری کرتے ہوئے، مصنوعی طور پر (artificially) گناہوں پر افسوس کا اظہار کرنا، واویلا مچانا، لوگوں کے بیچ میں بیٹھ کر اپنے آپ کو حقیر، فقیر، خطا کار اور گنہگار کہنا، اپنے آپ کو جہمی کہنا، تاکہ لوگ کہیں کہ نہیں آپ تو بہت نیک ہیں، لوگوں سے اپنی تعریف کروانا۔ اگر یہ واقعی اپنے آپ کو حقیر، گنہگار، خطا کار سمجھتا تو لوگوں کے سامنے کبھی بھی اعلانیہ نہ کہتا، چھپا کر رکھتا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اگر کوئی واقعتاً گنہگار اس طرح کی ریاکاری کرے اور لوگ اُسے کہہ دیں کہ واقعی آپ بڑے گنہگار ہیں، ہمیں آپ کی آخرت کی بڑی فکر ہے اور ہمیں بھی خطرہ ہے کہ آپ جہنم میں نہ چلے جائیں تو وہ بُرا مان جائے گا۔ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ میں اپنے آپ کو خطا کار، گنہگار کہتا رہوں اور لوگ مجھے نیک، پاکباز اور پارسا کہتے رہیں۔

محفل اور تنہائی کی نماز وغیرہ:

محفل میں نماز پڑھے گا تو بہت ٹھہر ٹھہر کر، طویل قیام، لمبے لمبے سجدے، لمبے رکوع کرے گا۔ محفل میں قرآن پڑھے گا تو بہترین تجوید کے ساتھ، مخارج بھی درست، سارے اصول بھی درست، اس لیے کہ لوگ عابد سمجھیں۔ اور تنہائی میں نماز پڑھتا ہے تو ٹکریں مارتا ہے، اُٹھک بیٹھک کرتا ہے۔

سنن ابن ماجہ میں ایک حدیث ہے، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ایک دفعہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حجرے سے نکل کر ہمارے پاس تشریف لائے۔ اس وقت ہم آپس میں مسج دجال کا تذکرہ کر رہے تھے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے کہا کہ:

((أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِمَا هُوَ أَخْوَفُ عَلَيْكُمْ عِنْدِي مِنَ الْمَسِيحِ الدَّجَالِ قَالَ قُلْنَا بَلَى فَقَالَ الشِّرْكَ الْخَفِيُّ أَنْ يَقُومَ الرَّجُلُ يُصَلِّيَ فَيَزِينُ صَلَاتَهُ لِمَا يَرَى مِنْ نَظَرِ رَجُلٍ))^(۱)

”میں تمہیں وہ چیز بتاؤں جو میرے نزدیک تمہارے لیے دجال سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ ہم نے عرض کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ضرور بتلائیے وہ کیا چیز ہے؟ فرمایا ”وہ شرک خفی ہے، جس کی مثال یہ ہے کہ آدمی نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہو، پھر اپنی نماز کو اس لیے لمبا کر دے کہ کوئی آدمی اس کو نماز پڑھتا دیکھ رہا ہے۔“

فرض کریں ایک شخص عام طور پر ۵ سیکنڈ کا سجدہ کرتا ہے لیکن اُس نے محسوس کیا کوئی مجھے دیکھ رہا ہے تو اب اُس نے ۵ سیکنڈ کے بجائے ۸ سیکنڈ کا سجدہ کیا۔ تو جو ۳ سیکنڈ اس نے زیادہ سجدہ میں لگائے وہ یقیناً اللہ کے لیے نہیں تھے۔ لہذا سجدے کے اندر اللہ کے ساتھ کوئی اور شریک ہو گیا۔ یہی تو شرک ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی شامل کر لیا جائے اور اللہ کے سوا کسی اور کو بھی دکھانا مقصود ہو۔ پھر شرک ریا کاری کے ذریعے بھی آ جاتا ہے۔

ریا کی ایک اور علامت:

ریا کاری کی ایک اور علامت یہ ہوتی ہے کہ اپنے عیوب پر شرمندہ نہیں ہوتا، اپنے گناہ پر ندامت محسوس نہیں کرتا، نادم نہیں ہوتا۔ نہ اُس کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے، نہ اصلاح کرتا ہے بلکہ اس کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ دیکھئے! گناہ چھپانے کی تو ہمیں ترغیب دی گئی ہے، حکم ہے کہ اپنے گناہوں کا اعلان مت کرو، چرچا مت کرو۔ اگر کوئی اس لیے اپنے گناہ چھپاتا ہے تو یہ ریا کاری نہ ہوگی۔ لیکن ساتھ ساتھ وہ اللہ کے سامنے بھی اپنے کیے پر نادم اور شرمندہ ہے۔ ایسے شخص کے گناہ چھپانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی ہمت افزائی نہ ہو، وہ بھی اس کو اختیار نہ کر لیں یا لوگ مجھے بُرا نہ سمجھیں۔ اپنے گناہوں کو تو وہ یقیناً بُرا سمجھتا ہے، اصلاح بھی کرتا ہے، عیب کو دور کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے، دوبارہ دہرانے سے تو بہ کرتا ہے اور اللہ سے استغفار کرتا ہے۔ لیکن ریا کار نہ استغفار کرتا

(۱) سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، باب الزیادۃ والشفعة

ہے اور نہ گناہ کو بُرا سمجھ رہا ہوتا ہے، اپنے فعل کو گناہ گردانتا ہی نہیں چہ جائیکہ اللہ کے سامنے شرمندہ اور نادم ہوتا۔ یہ صرف اس لیے چھپاتا ہے کہ میری نیکی کا بھرم نہ کھل جائے اور میں لوگوں کی نظروں سے نہ گر جاؤں۔ وہ اس لیے اپنے عیب لوگوں سے چھپانے کی پوری کوشش کرتا ہے۔

ریا کے سہارے کوئی عمل قبول نہیں:

ریا کاری کے ساتھ کوئی نیکی، کوئی عمل، کوئی اچھائی، اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ ریا کار اللہ کو دھوکا دے رہا ہوتا ہے۔ وہ کہتا تو ہے کہ اللہ کے لیے کر رہا ہوں لیکن اصل میں اپنی شہرت کے لیے نیکیاں کر رہا ہوتا ہے۔ ریا کاری کی مثال کسی ایسے تاجر کی سی ہے جو بیک وقت دو لوگوں کو اپنی واحد شے بیچ دے۔ ایک گاہک کو متاع دے کر اس سے قیمت وصول کر لے اور اگلے گاہک سے بھی اسی مال کے عوض قیمت وصول کرنا چاہے۔ تو بکا ہوا مال تو کوئی نہیں خریدتا یہ تو دوسرے خریدار کو اس نے دھوکہ دے دیا۔ تو ریا کار ایسا ہی ہے کہ یہ لوگوں کے ہاتھ اپنی تعریف اور شہرت کی خاطر، سب نیکیاں بیچ دیتا ہے اور پھر اللہ سے بھی امید رکھتا ہے کہ اللہ بھی میرا یہ بکا ہوا مال خرید لے اور مجھے جنت دیدے۔ لیکن اللہ تو ایسا مال نہیں قبول کرتا۔ ہم کسی دکان میں جائیں اور دکان میں کسی سوٹ پر ناقابل خرید (sold tag) کی پرچی لگی ہو تو ہم تو اس چیز کو نہیں خریدتے۔ تو یہ ریا کار اپنے سب اعمال کا سود لوگوں سے کر چکا ہوتا ہے تو اللہ کے ہاں اس کے کسی عمل کا کوئی اجر نہیں۔

حضرت ابو سعید بن فضالہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ:

((إِذَا جَمَعَ اللَّهُ النَّاسَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لِيُؤْمَ لَازِبٍ فِيهِ نَادَى مُنَادٍ مَنْ كَانَ أَشْرَكَ فِي عَمَلٍ عَمِلَهُ لِلَّهِ أَحَدًا فَلْيُطْلَبْ ثَوَابَهُ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ أَغْنَى الشُّرَكَاءَ عَنِ الشِّرْكَ))^(۱)

”جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جس کے آنے میں کوئی شک نہیں سب انسانوں کو جمع کرے گا تو ایک مُنادی یہ اعلان کرے گا کہ جس شخص نے اپنے کسی عمل میں، اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی شریک کیا تھا وہ اس کا ثواب اس دوسرے سے جا کر لے لے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ سب شرکاء سے زیادہ بے نیاز ہے کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔“

مسلم کی ایک حدیث مبارکہ میں یہ مضمون آتا ہے کہ:

((قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللَّهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى أَنَا أَغْنَى

(۱) جامع الترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ومن شوزة الکھف

الشَّرْكَاءُ عَنِ الشَّرْكِ مَنْ عَمِلَ عَمَلًا أَشْرَكَ فِيهِ مَعِيَ غَيْرِي تَرَكْتُهُ
وَ شِرْكُهُ)) (۱)

”اللہ تعالیٰ کی رضا اور رحمت کے علاوہ کسی اور سے کچھ حاصل کرنے کی جو خواہش رکھے تو اللہ اس کو اور اس کے شرک دونوں کو چھوڑ دیتا ہے۔“

ترمذی کی ایک اور حدیث مبارکہ ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
((قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَعَوَّذُوا بِاللَّهِ مِنْ حِبِّ الْحَزَنِ قَالُوا يَا
رَسُولَ اللَّهِ وَمَا حِبُّ الْحَزَنِ قَالَ وَادٍ فِي جَهَنَّمَ تَتَعَوَّذُ مِنْهُ جَهَنَّمُ كُلَّ يَوْمٍ مِائَةَ
مَرَّةٍ فَلَنْ تَأْيَا رَسُولَ اللَّهِ وَمَنْ يَدْخُلْهُ قَالَ الْقُرَاءَةُ الْمَرْأَةُ بِأَعْمَالِهِمْ)) (۲)
تم لوگ غم کی خندق سے پناہ مانگا کرو۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا ”یا رسول اللہ غم کی
خندق کیا چیز ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جہنم میں ایک وادی یا خندق ہے جس کا حال اتنا برا
ہے کہ خود جہنم دن میں سو مرتبہ اس سے پناہ مانگتی ہے۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ اس میں کون
لوگ جائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”وہ عبادت گزار یا وہ زیادہ قرآن پڑھنے والے جو
دوسروں کو دکھانے کے لیے یہ اعمال کرتے تھے۔“

تو یہ غیر شعوری طور پر جو رہا آ جاتی ہے اس سے بچنے کے لیے اللہ کی پناہ تلاش کریں۔ شعوری
طور پر تو خیر انسان پہچان لے گا کہ ریا کاری ہو رہی ہے اپنی اصلاح کر لے گا، لیکن اگر اس کو شعور ہی
نہیں کہ یہ کام ریا کاری میں شامل ہے، یا میں یہ کر کے اور یہ کہہ کر ریا کاری کا مرتکب ہو رہا ہوں یا
ہو رہی ہوں تو اللہ کے علاوہ اور کون ہمیں بچائے گا۔ ایک دُعا یہ بھی ہے:

((اللَّهُمَّ زَحْمَتِكَ أَزْجُو فَلَا تَكْلُنِي إِلَى نَفْسِي طَرْفَةَ عَيْنٍ وَأَصْلِحْ لِي شَانِي
كَلَّةَ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ)) (۳)

”اے اللہ میں تیری رحمت کا اُمیدوار ہوں۔ پس ایک لمحے کے لیے بھی مجھے میرے نفس
کے حوالے نہ کرو اور میرے سارے کام تو سنوارو، تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔“
تو انسان اللہ سے اپنا تعلق جوڑے، اللہ سے قریب ہو، اپنے اندر اللہ کی محبت پیدا کرے۔

(۱) صحیح مسلم، کتاب الزہد والرفاق، من اشرك في عمله غير الله

(۲) جامع الترمذی، کتاب الزہد، باب ما جاء في الزيادة والسنة

(۳) سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب ما يقول اذا أصبح

ایک اور دعا جو نبی اکرم ﷺ مانگا کرتے تھے۔

((اللَّهُمَّ طَهِّرْ قَلْبِي مِنَ النِّفَاقِ وَعَمَلِي مِنَ الرِّيَاءِ وَ لِسَانِي مِنَ الكَذِبِ وَعَيْنِي

مِنَ الحِيَانَةِ فَإِنَّكَ تَعْلَمُ خَائِنَةَ الأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ))^(۱)

”اے اللہ! میرے دل کو نفاق سے، میرے عمل کو ریا و نمود سے، میری زبان کو جھوٹ سے، اور میری آنکھ کو خیانت سے پاک کر دے۔ بے شک تو آنکھوں کی خیانت اور دلوں کی چھپی باتوں کو جانتا ہے۔“

ریا کا تعلق نیت سے ہے:

”سمعہ وریا کا تعلق نیت سے ہے۔ دکھاوا (display) کرنے کی نیت ہو، اکرنفون (flaunt) کرنے کی نیت ہو اور پھر کوئی کام کیا جائے تو پھر وہ ریا کاری ہوگی۔ اب اگر کوئی شخص دوسروں کو ترغیب (encourage) دینے کے لیے کوئی اچھا کام ظاہر کرتا ہے تو یہ ریا کاری نہ ہو گی، کہ لوگوں کی بھی ہمت افزائی ہو اور وہ اس آدمی سے اثر (inspiration) لیں اور اچھے کاموں میں لگ جائیں۔ یہ ایک اچھا نمونہ پیش کرنا ہوگا۔ پھر سکھانے کے لیے اگر کوئی عمل کرتا ہے کہ لوگ صحیح (proper) طریقہ سیکھ جائیں۔ یہ بھی ریا میں نہیں آئے گا۔“

پھر دشمن پر رعب ڈالنے کے لیے کوئی دکھاوے کا سا انداز اختیار کرتا ہے تو یہ بھی ریا نہ ہوگی بلکہ یہ دشمن کے خلاف ایک چال شمار کی جائے گی۔ اُس پر نفسیاتی دباؤ شمار کیا جائے گا، تاکہ اس کے دل کے اندر مسلمانوں کا رعب پیدا ہو۔ یہ اُس کی عبادت ہوگی۔ ریا کاری نہ ہوگی۔ حضرت ابو ذرؓ کے بارے میں آتا ہے کہ غزوہٴ احد میں جب نبی اکرم ﷺ نے اُن کو اپنی تلوار عطا فرمائی تو انہوں نے تلوار ہاتھ میں لی، سر پر لال رومال باندھا اور تلوار لے کر وہ اکڑ کر چلنے لگے۔ آپ ﷺ نے دیکھ کر فرمایا ”اللہ تعالیٰ کو یہ چال پسند نہیں ہے، مگر اس موقع پر پسند ہے اس لیے کہ ان کا رعب دشمن پر پڑ رہا ہے۔“

سورۃ الانفال آیت نمبر ۶۰ میں آتا ہے:

{وَأَعِدُّوا لَهُمْ مِمَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّن قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الخَيْلِ تُرْهَبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ}

”کہ تم جتنی استطاعت رکھتے ہو تم جنگی ساز و سامان تیار کر کے رکھو، تاکہ اللہ کے دشمن اور تمہارے دشمن کے دل میں تمہارا رعب پیدا ہو جائے۔“

(۱) کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال، کتاب الدعاء، الفصل السادس جوامع الادعية

تو اپنی چیزوں کی نمائش کرنا، دکھاوا کرنا، کہ دشمن ڈر جائے، دشمن اسلام سے مرعوب ہو جائے۔ یہ جائز ہے یہ دکھاوانہ ہوگا۔

نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں یہ ہوا کہ جب آپ ﷺ نے ریا اور شہرت کی طلب کے بارے اتنا کچھ ارشاد فرمایا تو صحابہ رضی اللہ عنہم بہت ڈر گئے۔ پھر یہ ہونے لگا کہ اگر کسی کے نیک عمل کے بارے میں لوگوں کو پتہ چل جاتا تھا اور کسی کی نیکی کا چرچا ہونے لگتا تھا اور لوگ اللہ کا نیک بندہ سمجھ کر اس شخص سے محبت کرنے لگتے تو وہ ڈر جاتا تھا کہ شاید ریا کاری ہوگئی ہے اور اب اللہ کے ہاں اس کا یہ عمل قبول نہ ہوگا۔

حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: اس شخص کے بارے میں آپ ﷺ کا کیا خیال ہے جو اچھا عمل کرتا ہو اور لوگ اس کی تعریف کرتے ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا، ”یہ تو مومن کے لیے دنیا میں نقد بشارت ہے۔“ یعنی پیش گوئی ہے کہ اللہ نے اس کا یہ عمل قبول فرمایا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ایک دفعہ گھر میں نماز پڑھ رہے تھے۔ ایک آدمی آیا اور اس نے نماز پڑھتے دیکھ لیا۔ تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میرے دل میں خوشی پیدا ہوئی کہ اس شخص نے مجھے نماز جیسے اچھے کام میں مشغول پایا، پھر پریشانی ہوئی کہ کہیں ریا تو نہیں ہوگئی۔ پھر انہوں نے رسول اکرم ﷺ سے ذکر کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ ریا نہیں ہے تم کو اس صورت میں تنہائی میں عبادت کا ثواب بھی ملے گا اور لوگوں کے سامنے عبادت کا اجر بھی ملے گا۔

یہ ریا کیوں نہ ہوئی؟ فرق کس چیز کا ہے؟ ارادے کا، تمنا اور چاہت کا فرق ہے، نیت کا فرق ہے، خود نہیں چاہا، خود ہی اللہ کی طرف سے ایسی صورت حال پیدا ہوگئی تو وہ پھر ریا میں شمار نہ ہوگی۔

ریا کا علاج:

اب اگر کسی کو محسوس ہوتا ہے کہ میرے اندر ریا ہے تو اس کا علاج کیا ہے؟ علاج یہ ہے کہ اپنے اندر اخلاص پیدا کرنے کی کوشش کرے اور اپنے بارے میں ایسی باتیں نہ کرے۔ مثلاً میں وقت پر پوری پانچ نمازیں پڑھتا ہوں، روزانہ قرآن کی تلاوت کرتا ہوں، تفسیر بھی زیر مطالعہ رہتی ہے، تہجد بھی پڑھتا ہوں، نقلی روزے بھی رکھتا ہوں۔ لیکن اگر کسی کو شوق دلانے کی غرض سے ذکر کیا یا کسی کو ترغیب دینے کی نیت ہے یا کسی کو اللہ کی عبادت پر آمادہ کرنا ہو تو ذکر کرنا برائی نہیں۔ ہاں اپنی نیت کو ٹٹولتے رہیں، سورہ اخلاص ضرور پڑھیں اور اس کے معنی پر غور کریں اور تنہائیوں کو عبادت سے سجا لیں۔ خوبصورت نماز پڑھیں، آہستہ آہستہ، ٹھہر ٹھہر کر قرآن کی مختلف سورتیں یاد کرنے کی کوشش کرتے رہیں

تا کہ نمازوں میں زیادہ سے زیادہ قرآن کی تلاوت کی جاسکے اور نیک اعمال اختیار کریں۔ چھوٹی سی چھوٹی نیکی کا بھی موقع ضائع نہ ہو، چاہے چڑیوں کو سوکھی روٹی ہی کیوں نہ ڈالیں، اللہ کی خاطر ہونا چاہیے۔ نیت اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا ہو۔ خواہ راستے سے پتھر ہی ہٹانا کیوں نہ ہو یا کوئی خاردار جھاڑی ہی ہٹانا ہو۔ نیت صرف اللہ کی رضا ہو! اللہ کی خاطر اور اللہ کی محبت میں! پھر اگر لوگوں کی تعریف سننے کو دل چاہے تو فوراً اللہ کو یاد کریں۔ فوراً اپنی توجہ اللہ کی طرف کر لیں، یہ دکھاوا ایک لت (addiction) ہے، اس سے رفتہ رفتہ نجات ملے گی۔ اگر کبھی دل چاہے تو اپنا رخ اللہ کی طرف کر لیں۔

انسان کی نفسیات ہے کہ وہ جب کوئی اچھا کام کرتا ہے تو چاہتا ہے کہ سب کو پتہ چلے، میری تعریف ہو۔ انسان خود نمائی پسند (exhibitionist) ہے، لوگوں کی نظروں کا متلاشی رہتا ہے کہ وہ دیکھیں اور سراہیں (appreciate) کریں، وہ اپنی خوبیوں کا مظاہرہ (display) کرنا چاہتا ہے۔ انسان کو اپنی تعریف بہت اچھی لگتی ہے، یہ رجحان (tendency) انسان میں پایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس طلب کو صحیح رخ پر ڈالنے کا طریقہ ہمیں بتلا دیا کہ یہ جو نمائش کا عنصر تمہارے اندر پایا جاتا ہے، اس کا صحیح رخ یہ ہے کہ قیامت کے دن سب مخلوق کے سامنے انسانوں کے اعمال دکھائے جائیں گے وہاں کے لیے اعمال کی تیاری کی جائے۔ دنیا میں جب کوئی چیز نمائش (exhibition) کے لیے بنائی جاتی ہے تو اس کو آخری شو (final show) سے پہلے بالکل خفیہ رکھا جاتا ہے۔ تو انسان بھی اپنے اعمال دنیا میں چھپا کر رکھے تاکہ قیامت کے دن اللہ ان کو تمام انسانوں کے سامنے ظاہر (display) کرے۔ قرآن میں آتا ہے:

{وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِئَتْ} (التکویر: ۱۰)

”جس دن صحیفے نشر کر دیے جائیں گے۔“

سورۃ النجم میں آتا ہے:

{وَأَنْ سَعِيَهُ سَوْفَ يُرَى} (النجم: ۴۰)

”اس کی کوشش عنقریب دیکھی جائے گی۔“

تو وہاں اس دن سب کچھ دکھا دیا جائے گا، سنا دیا جائے گا۔ دفتر کے دفتر کھول کر رکھ دیئے جائیں گے۔ اللہ بصیر ہے، وہ خوب دیکھ رہا ہے تو اللہ کو دکھانے کے لیے کرو۔ وہ قدر دان بھی ہے اور اجر دینے والا بھی۔ اللہ سمیع ہے، سب سن رہا ہے، اللہ کو سناؤ، اسی سے صلہ چاہو، اس سے تعریف پانے کے لیے کام کرو۔ اس طرح ہم ریاکاری پر ان شاء اللہ قابو پالیں گے۔

اب ایک شخص ہے جو تنہائی میں نماز پڑھتا ہے تو تین کے بجائے پانچ مرتبہ تسبیح پڑھتا ہے، تو رکوع تو لمبا ہوگا اور تین کے بجائے پانچ دفعہ سبحان ربی الاعلیٰ کہتا ہے تو سجدہ بھی لمبا ہوگا۔ یا مثال کے طور پر وہ عصر کی سنتیں ضرور پڑھتا ہے، اب اگر وہ کسی مجلس یا محفل میں ہے تو وہاں اس کو کیا کرنا چاہیے؟ میری ناقص رائے میں اس کو وہاں بھی یہ عمل جاری رکھنا چاہیے۔ کیوں کہ تنہائی میں اور محفل میں دونوں جگہ وہ اللہ ہی کے لیے پڑھے گا۔ یہ صرف دکھانے کے لیے نہیں ہوگا، یہ اس کا معمول ہے۔

ریا کاری کا خوف:

مجلس میں شیطان اس کے دل میں یہ خیال ڈالے گا کہ اگر لمبی نماز پڑھی تو لوگ ریا سمجھیں گے، کہیں گے دکھاوے کے لیے لمبی لمبی نمازیں پڑھتا ہے تو بہتر ہے کہ مختصر نماز کر دو اور اس طرح اس کی نیکی میں کمی کروائے گا اور وہ ریا کے خوف کی وجہ سے نماز کو مختصر کرتا ہے، ایک اچھا کام چھوڑ دیتا ہے اس کو ریا کا خوف کہتے ہیں۔ یہ ریا سے بھی بدتر چیز ہے۔ کیوں کہ ریا کاری کرنے والا کم از کم اچھا کام تو کرتا ہے، لوگوں کو دکھانے کے لیے ہی سہی۔ جس کے اندر خوف الہی ہے وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہونے کے لیے اچھا کام چھوڑ دیتا ہے۔ تو دونوں کی جڑ میں بیماری مشترک (common) ہے یعنی لوگوں کے دیکھنے کا احساس، دونوں کے اندر بیماری ریا کاری ہے۔ سو کرنے کا کام یہ ہے کہ انسان لوگوں کی نظروں سے اپنے آپ کو نہ جانچے۔ جیسے وہ تنہائی میں کام کرتا ہے، سب کے سامنے بھی اسی طرح کرے۔ خلوت اور جلوت میں اپنے عمل کو یکساں رکھنے کی کوشش کرتا رہے تو عمل بہتر ہو جائے گا۔ کہیں یہ نہ ہو کہ ریا کاری کے خوف سے اچھے اعمال چھوڑ دے اور شیطان کامیاب ہو جائے۔ شیطان کا ہتھکنڈا کارگر اور اس کا وار غالب آ جائے۔ ہاں اپنی نیت کا تزکیہ ضرور کرتا رہے کہ نیت کے اندر کوئی بگاڑ یا دکھاوانہ ہو۔ انسان اس کا فیصلہ خود کر سکتا ہے کہ تنہائی میں ہمارا رویہ کیا ہے اور محفل میں کیا ہے؟ کہیں ہم دو غلے پن کا شکار تو نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ریا سے پاک رکھے۔

سرکشی

”سرکشی“ کا مفہوم ہے بغیر کسی وجہ کے لوگوں کے ساتھ زیادتی کرنا، بلاوجہ بڑا سلوک کرنا۔ سرکشی کے لیے قرآن حکیم نے ”بغی“ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

{يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا بُغِيْتُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ} (یونس: ۲۳)

”اے لوگوں تمہاری بغی تمہارے اپنے خلاف جاڑے گی۔“

اسی طرح سورۃ القصص میں یہ مضمون آتا ہے:

{إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ} (القصص: ۷۶)

”بے شک قارون موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے تھا مگر اس نے ان کے خلاف بغاوت کی۔“

سورہ نحل میں ارشاد ہوا ہے:

{وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ} (النحل: ۹۰)

”اللہ تعالیٰ منع فرماتا ہے تم لوگوں کو فحش کاموں سے، اور منکر سے، اور بغی سے۔“

اس سرکشی یا بغاوت کے بہت سے درجے ہیں۔ یوں سمجھیے کہ بڑے گناہ سے لے کر کمتر سے لے کر گناہ تک سب کے سب سرکشی کے زمرے (category) میں آتے ہیں۔ ایک قسم کی سرکشی وہ ہے جو کہ صریح گناہ ہے یعنی دوسروں پر ظلم اور زیادتی۔ جو لوگ اس قسم کی سرکشی کا شکار ہوتے ہیں ان کی شخصیت بالکل مسخ ہو کر رہ جاتی ہے، ان کو معاشرے میں برا سمجھا جاتا ہے۔

کمتر سرکشی:

سرکشی کا کمترین درجہ جن لوگوں میں پایا جاتا ہے انہیں معاشرے میں برائیں سمجھا جاتا (نہ وہ واقعتاً برے ہوتے ہیں) لیکن ان میں سرکشی ہوتی ہے جو چھوٹی چھوٹی باتوں میں ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ ویسے تو دوسروں کے ساتھ اچھے رہتے ہیں، ان کا خیال بھی رکھتے ہیں، ان کے ساتھ اچھے معاملات بھی کر رہے ہوتے ہیں لیکن کہیں کہیں ----- جیسے مشین کی سوئی جگہ جگہ دکھانے لیتی ہے اور سلائی خراب نظر آتی ہے اسی طرح کچھ لوگ ٹھیک ٹھاک چلتے چلتے اچانک اپنے ایک جملے سے یا کسی عمل سے ایک دم اذیت پہنچا دیتے ہیں، جیسے اچھا بھلا کھانا کھاتے کھاتے اچانک دانتوں تلے ہڈی آجائے تو ایک دم انسان کے اعصاب جھنجھلا جاتے ہیں، بالکل اسی طرح سرکشی کرنے

والے اچھا بھلا معاملہ کرتے کرتے اچانک کوئی ناگوار جملہ یا غیر مناسب عمل کر دیتے ہیں جس سے سامنے والے کے اعصاب جھنجھلا کر رہ جاتے ہیں۔

بڑی سرکشی:

جہاں تک بے بنیاد باتوں میں بغاوت (groundless hatred) کا تعلق ہے، جیسے کہ قارون کے متعلق ذکر کیا گیا کہ اُسے حضرت موسیٰ عَلَيْهِ السَّلَام سے نفرت تھی اور پھر وہ پوری قوم سے ہی بغاوت پر اتر آیا، اپنی قوم کے ساتھ ہی زیادتی کرنے پر آمادہ ہو گیا، اپنی قوم کے خلاف اس نے سازشیں شروع کر دیں۔ تو یہ اس نے بہت بڑی بغاوت کا ارتکاب کیا، بعض دفعہ بغاوت اس وجہ سے ہوتی ہے کہ ہم ایک قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور ہمارا مخالف دوسری قوم سے، محض اس ایک وجہ سے ہم ان کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ تاریخ میں ایسی کئی مثالیں ہیں کہ لوگوں نے قومیت کے نام پر ہزاروں بلکہ لاکھوں انسانوں کو قتل کروادیا، بے صورتوں کو صرف اس لیے مروادیا کہ وہ کسی اور قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کی پچھلی صدی میں سب سے بڑی مثال ہٹلر (Hitler) ہے۔ اُسے یہودی قوم سے نفرت تھی۔ صرف اس لیے ان گنت انسانوں کو مروادیا کہ وہ یہودی تھے، جس کو آج نسل کشی (genocide) کہتے ہیں۔ یا پھر بوسنیا (Bosnia) میں رہنے والے مسلمانوں کا صرف اس لیے قتل عام کیا گیا کہ وہ مسلمان تھے، یہ یورپ کے کافروں نے کیا۔ بس یہ نبی ہے کہ بلا وجہ، کوئی قصور نہیں، کوئی جرم نہیں، کوئی دشمنی یا جھگڑا نہیں بس صرف اس بنا پر کہ یہ دوسرے مذہب سے تعلق رکھتے ہیں، الگ قوم ہے۔ جیسے کہ مسلمانوں میں شیعہ سنی کی تفریق ہے جو گہری سے گہری ہوتی جا رہی ہے، مرنے مارنے پر اتر آتے ہیں۔ اس کی بنیاد صرف اور صرف بغاوت ہے، یہ دونوں ایک دوسرے کو صرف اس لیے مار رہے ہیں کہ شیعہ سنی الگ فرقے ہیں، عقائد الگ ہیں، اس طرح مسلمان ہوتے ہوئے بھی سرکشی کی وجہ سے قتل و غارت گری پر اتر آئے۔ یہ تو بہت بڑے درجے کی بغاوت ہے۔

تالمود میں قول آتا ہے کہ بغاوت بت پرستی، زنا اور قتل کے برابر ہے۔ یعنی انسان کے لیے

انتہائی نقصان دہ ہے۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ ہم اس بغاوت کا شکار نہیں، ہم گھروں

میں رہنے والے، پُر امن معاشرے میں رہنے والے عام انسان ہیں۔ نہ ہمارے پاس وہ طاقت

ہے اور نہ اتنا اختیار ہی ہے کہ اتنے بڑے پیمانے (scale) پر تباہی اور بربادی پھیلائیں، اس طرح بے وجہ نفرت (groundless hatred) کی بنیاد پر کسی کو قتل کیا جائے یا تشدد کا نشانہ بنایا جائے یہ تو ہم الحمد للہ نہیں کرتے۔ دراصل ہم ان لوگوں میں سے ہیں جو چھوٹی چھوٹی باتوں میں سرکشی کا شکار ہوتے ہیں۔

ماتحتوں کی سرکشی:

جن لوگوں کے اندر سرکشی موجود ہوتی ہے وہ جب ماتحت (subordinate) ہوتے ہیں تو ایک طرح سے بغاوت پر تیار رہتے ہیں، باغی ہوتے ہیں، حکام (authority) کے ساتھ بغاوت کا جذبہ سرگرم رہتا ہے۔ جس کو انگریزی میں کہا جاتا ہے (rebel without a cause) بلا وجہ بات نہیں مانتی۔ ماتحتوں کی مختلف شکلیں اور درجے ہیں مثال کے طور پر اولاد والدین کے ماتحت ہوتی ہے، اب اگر کسی اولاد میں سرکشی کا جذبہ ہے تو والدین کے ساتھ ہر بات میں ضد اور ہٹ دھرمی پر اتر آئیں گے، حکم نہیں ماننا بلکہ والدین کی ہر بات کے خلاف جانا ہے۔ اگر کوئی کام کرنے کا ارادہ بھی ہوگا لیکن چونکہ ماں باپ نے یہ کرنے کا حکم دیا ہے تو نہیں کریں گے کیوں کہ اندر بغاوت ہے۔ والدین کے چھوٹے سے چھوٹے فیصلوں پر بھی سوال کریں گے، یہ کیوں کریں اور یہ کیوں نہ کریں؟ والدین سے ہمیشہ شکاکی رہیں گے، ان کی ساری خوبیاں نظروں سے اوجھل ہو جائیں گی اور دل کے اندر شکایتیں پلٹی رہیں گی، خفگی (resentment) بڑھتی رہے گی، جلتے کڑھتے رہیں گے۔

اسی طرح اگر کسی بیوی میں بغاوت کے جذبات ہیں تو ہر وقت شوہر اور سسرال کے خلاف باتیں کرتی رہے گی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر شوہر کو چیلنج کیا جائے گا، معمولی معمولی باتوں میں شوہر کی نافرمانی کریگی، خاوند کی ہر بات کے خلاف جانا، الٹ کرنا، ہر وقت ایک محاذ آرائی سی کیفیت رہے گی، شوہر اور سسرال کے خلاف ایک محاذ بنا رکھا ہوگا۔

اسکول یا کالج میں طلبہ میں بغاوت ہوگی تو اساتذہ کے خلاف یا انتظامیہ کے خلاف بغاوت (rebellious attitude) کریں گے۔ یہ قانون کیوں بنا یا گیا ہے، امتحان کی یہ تاریخ کیوں مقرر کی ہے، نصاب میں یہ کیوں شامل ہے؟ یہ وہ انداز محاذ آرائی ہے جس کی وجہ سے ماحول اور معاشرے میں ہر وقت تصادم (conflict) کی فضا رہتی ہے۔

بغاوت کا ضرر:

بغاوت کی وجہ سے ماحول تناؤ کا شکار (tense) رہتا ہے، ہر وقت لوگوں کے اعصاب تنے رہتے ہیں۔ بغاوت کرنے والا خود بھی پریشانی (tension) میں رہتا ہے اور جس کے خلاف وہ بغاوت کر رہا ہوتا ہے اس کو بھی پریشان کر دیتا ہے، جن بیویوں میں یا بچوں میں بغاوت کا مادہ ہوتا ہے، ایسی بیویوں کے شوہر اور ایسے بچوں کے والدین بہت دکھی رہتے ہیں۔

بغاوت کرنے والوں کا رویہ:

ایسے لوگوں کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کس بات پر اڑ جائیں گے۔ کوئی دلیل (logic) نہیں ہوتی، ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر رد عمل دکھاتے ہیں۔ کسی آفس میں کام کرتے ہوں گے تو کبھی رویہ ایسا ہی ہوگا کہ ہم یہ قانون، یہ بات، یہ حکم نہیں مانتے آفس کے ہر قانون اور ہر حکم پر نکتہ چینی ضرور کریں گے۔ ایسا لگتا ہے گویا ان کا مزاج ہی انتقامی ہو گیا ہے (getting back at the world in general) سب کے خلاف ان کے اندر کچھ منفی جذبات پرورش پارہے ہوتے ہیں۔

پھر اگر یہ ماتحت نہ ہوں بلکہ ان کے پاس طاقت اور اقتدار ہے تو یہ دبانے والے (oppressors) بن جاتے ہیں، تکم پسند (authoritarian) ہو جاتے ہیں۔ ذرا سی طاقت ہاتھ میں آجائے تو ماتحتوں کو ناحق دبا جاتا ہے، بہت ہی اکھڑ مزاج (rude) ہوتے ہیں اور اس کی وجہ سے ماتحتوں کی شخصیت کچلنے لگتی ہے، ان کی شخصیتوں میں بگاڑ (distortion) آنے لگتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی آفس میں ایک معمولی سا افسر ہے لیکن کچھ نہ کچھ تو اس کے پاس اختیار ہوگا، اب کوئی کلرک ہے جس کا فائلوں پر اختیار ہوں اور کوئی اس کے پاس کوئی فائل مانگنے آتا ہے تو اس کو یہ احساس ہوتا ہے کہ میں ان فائلوں پر مختار ہوں اور یہ بندہ میرا محتاج ہے، مجھ سے کچھ مانگ رہا ہے، اس کو اپنی حیثیت (position) کا احساس ہوتا ہے تو وہ فائل ہوتے ہوئے بھی نہیں دیتا اور بہانہ کر دیتا ہے کہ ڈھونڈنی پڑے گی، اس وقت نہیں مل رہی وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح دوسروں کو پریشان دیکھ کر ان کو ستا کر اور اُداس (upset) دیکھ کر عجیب سی مسرت (satisfaction) محسوس کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں کہ جن میں معمولی سی بھی سرکشی ہو اور ان کے پاس اختیار (authority) آجائے تو یہ دوسروں کو عاجز اور تنگ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ایک اور مثال سے سمجھیں لیکن میں کام کرنے والا خانہ ماں ہے یا کوئی اور ملازم ہے، وہ گھر والوں کے ساتھ، اپنے

مالکوں کے ساتھ تو اچھی رہے گی یا رہے گا لیکن جو اُس سے نیچے (juniors) ہیں ڈرائیور، صفائی والی، مالی وغیرہ ان کو تنگ کریں گے، وقت پر ناشتہ، کھانا اور چائے نہیں دیں گے اور ان پر حکم چلائیں گے۔ وہ بچارے دس دس دفعہ کھانا، ناشتہ، چائے مانگیں گے مگر وہ بہانے بہانے سے ٹالتے رہیں گے اور اس طاقت (power) کا مزہ اٹھاتے ہیں کہ دینا نہ دینا ہمارے اختیار میں ہے۔ کبھی جلی ہوئی روٹی دے دیں گے یا ٹھنڈی چائے دے دیں گے۔ یہ سوچ سوچ کر ان کا نفس مطمئن ہوتا ہے کہ میں صاحب اختیار ہوں۔ اگر کسی استاد میں بغاوت کا مادہ ہے تو ایسے اساتذہ اپنے شاگردوں کو بے جا ڈانٹ ڈپٹ کر اور سختی کر کے خوشی محسوس کرتے ہیں، معمولی سی غلطی پر کڑی اور سخت سزا دے دیتے ہیں، شاگردوں کی بے عزتی کرتے ہیں، سب کے سامنے اُن کا مذاق اڑاتے ہیں، سزائیں دیتے ہیں، نظر انداز (ignore) کرتے ہیں۔ اس طرح سے ان کو طاقت کا احساس ہوتا ہے۔ ایسے استادوں کے زیرِ تربیت بچوں کی شخصیتوں پر انتہائی منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ کچھ لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب تک چھوٹے بچے کوڑا نہیں دیتے ان کو چین نہیں آتا، چنگلیاں لیں گے، نوچیں گے، چڑائیں گے اور جب بچہ تکلیف سے روتا ہے تو چھوڑ دیتے ہیں۔ شاید اندر کوئی نفسیاتی خرابی ہوتی ہے جس کا اظہار اس منفی رویے میں ہو رہا ہوتا ہے۔ یقیناً کوئی نہ کوئی احساس کمتری ہے جس کی وجہ سے بڑوں سے بغاوت کر کے اور چھوٹوں پر ظلم کر کے تسکین (satisfaction) ملتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے۔

((مَنْ لَمْ يَزَحْمِ صَغِيرًا وَ يَغْرِفْ حَقَّ كَبِيرٍ نَأْفَلَيْسَ مِنَّا))^(۱)

”وہ ہم میں سے نہیں ہے جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی عزت نہ کرے۔“

اب اگر ایسے لوگ ایک ہی ساتھ کام کر رہے ہیں، ایک ہی درجے اور حیثیت کے لوگ ہیں تو اپنے ہم درجہ ساتھیوں کے حقوق کا خیال نہیں رکھیں گے۔ ان کا جائز حصہ بھی ہتھیانے کی کوشش کریں گے کیوں کہ اُن کو جھڑپ (clash) میں لطف آتا ہے۔ لوگوں کی مخالفت کر کے اُن سے بہتر ہونے کا احساس ہوتا ہے، معمولی سی باتوں میں بھی اظہارِ بے ہمتی نہیں کر پاتے۔ مجلس میں اگر کسی نے کہا کہ آج ٹھنڈی زیادہ ہے تو کہیں گے نہیں آج تو موسم معتدل ہے، ایک کہے گا چائے ٹھنڈی ہے تو

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی الرحمة

کہیں گے نہیں یہ تو اچھی خاصی گرم ہے۔ یہ رویہ آپ سب نے کچھ لوگوں میں محسوس کیا ہوگا کہ انہیں دوسروں کو نیچا دکھانے سے مطلب ہوتا ہے، دوسروں کی بے عزتی مقصود ہوتی ہے۔ یہ سرکشی کی چند مثالیں ہیں۔

ازراہ مذاق سرکشی:

ایک اور سرکشی جس کو شاید معاشرے میں بُرا سمجھا ہی نہیں جاتا وہ عملی مذاق (practical jokes) ہے، یہ بھی دراصل نفی ہی ہے۔ یعنی لطف حاصل کرنے کے نام پر یا لطفیہ کے نام پر کسی کو تنگ کرنا، تمسخر اڑانا، بے وقوف بنانا اور پھر اس سے لطف اندوز ہونا۔ مثلاً کسی بھی نمبر پر فون کر کے کہہ دینا کہ آپ کا بچہ حادثے (accident) کا شکار ہو گیا ہے۔ ایسے لوگ دوسروں کی تکلیف اور پریشانی سے مزہ لیتے ہیں، یہ ان کے لیے تفریح ہوتی ہے۔ اپریل فول (april fool) کے نام سے باقاعدہ رسم منائی جاتی ہے جو کہ سراسر سرکشی ہے۔ لوگوں کو بے سرو پا خبریں اچانک سنا کر بے وقوف بنایا جاتا ہے، جھوٹ بول کر، کسی کو بے وقوف بنا کر اذیت دینا اور لطف اٹھانا بھی نفی ہے۔ دوسرے کوڑا کر، تکلیف پہنچا کر خود مسرت حاصل کرنا قطعاً طور پر سرکشی ہے۔

ایسے کاموں سے دنیا میں بھی دوسروں کے دلوں میں بغض، غصہ، نفرت اور دشمنی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور یہ عملی مذاق آخرت کے اعتبار سے بھی نہایت ہی نقصان دہ ہوں گے۔ یہ تمام اعمال جن کا ذکر ہوا یہ کرنے والے بُرے لوگ نہیں ہوتے، بس یہ کچھ عادت سی بن گئی ہوتی ہے کہ بچوں کوڑا کر یا عملی مذاق کر کے خوش ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ عام زندگی میں اچھے لوگ تصور ہوتے ہوں، خوش مزاج ہوں، مددگار بھی ہوں لیکن کہیں کہیں وہ غیر ارادی طور پر، غیر محسوس طریقے سے سرکشی پر آمادہ ہو جاتے ہوں۔ ہو سکتا ہے اس کا آغاز غیر شعوری عمر میں ہی ہو گیا ہو اور یہ عادت بڑھتے بڑھتے جوانی کے ساتھ جوان ہو گئی، بہت سنجیدہ (serious) اور تکلیف دہ شکل اختیار کر گئی، بچپن میں سرکشی کی جھلک تنگ کرنے میں نظر آتی ہے جب اسکول میں بچے اپنے ساتھ والے بچوں کو تنگ کرتے ہیں، کبھی بستہ چھپا دیا، کبھی لُنج بکس (lunch box) چھپا دیا، کبھی کسی بچے کے خلاف دوسروں کو اکٹھا کر لیا۔ اس کو تنہا (isolate) کر دیا اور اس کی پریشانی سے خوش ہو رہے ہیں یا گروہ بنا کر کسی ایک بچے کا مذاق اڑانا شروع کر دیا یہ سراسر سرکشی ہے۔

بعض بچے کسی بلی یا کتے کے بچے کو کلکڑیوں، ڈنڈوں، پتھروں سے مار مار کر بھگاتے ہیں اور

خوش ہوتے ہیں۔ جاپان میں بچوں میں آپس کے جھگڑوں کی وجہ سے اُن میں خودکشی کی شرح کافی حد تک بڑھ گئی ہے۔ اب تو باقاعدہ سات آٹھ سال کے بچے فون پر اپنے ہم عمر بچوں کو قتل کی دھمکیاں بھی دینے لگے ہیں، یہ شغل بن گیا ہے۔ اگر آپ کے ارد گرد کوئی ایسے کر رہا ہے یا کوئی اس قسم کے سرکشی کا شکار بن رہا ہے تو اس کو روکنا چاہیے۔ بعض دفعہ گھر کے بڑے بچوں کو مذاق کا نشانہ بناتے ہیں، بلاوجہ ڈانٹتے ہیں یا مارتے ہیں، اتنا تنگ کرتے ہیں کہ وہ عاجز آجاتے ہیں، اگر والدین کو یہ محسوس ہو رہا ہے کہ گھر کے دیگر افراد بچوں کو سرکشی کا نشانہ بنا رہے ہیں تو اس کو روکنے کی ضرورت ہے یا اگر کسی کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں کسی کو سرکشی کا نشانہ بنا رہا ہوں تو فوراً رُک جانا چاہیے۔

اسلام پسند نہیں کرتا کہ انسان مظلومی کی زندگی گزار دے اور اس کے اندر کسی رد عمل (reaction) میں بغض پیدا ہو جائے۔ لہذا اس تصادم (conflict) کو صل (resolve) کرنا ضروری ہے، اس کو صل کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

{وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُونَ} (الشوری: ۳۹)

”وہ لوگ ایسے ہیں کہ جب ان کو بغی پہنچتی ہے تو وہ (برابر کا) بدلہ لیتے ہیں۔“

اگر بدلہ نہیں لیں گے تو دل میں بغض پالتے رہیں گے اور بغض تو خود بہت بری چیز ہے تو بغض پالنے سے بہتر ہے کہ بدلہ لے لیں اور اسی سورۃ میں آگے یہ بات فرمائی کہ:

{فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ} (الشوری: ۴۰)

”جو معاف کر دے اور اصلاح کر لے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔“

اصلاح کی کوشش کے لیے تصادم ضروری ہے۔ بعض دفعہ جو شخص سرکشی کر رہا ہوتا ہے اس کو خود احساس نہیں ہوتا کہ وہ دوسرے کے ساتھ زیادتی کر رہا ہے، ایسے لوگ دوسروں کو ایک تختہ مشق (punching bag) سمجھتے ہیں اور غیر شعوری طور پر زیادتی کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے ایسے شخص کو احساس دلانا چاہیے کہ آپ میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ محتاط ہو جائے۔ جب لوگ خاموشی سے سرکشی برداشت کیے چلے جاتے ہیں تو ہو سکتا ہے سرکشی کرنے والے کو احساس ہی نہ ہو کہ دوسرے کو تکلیف ہو رہی ہے، ذہنی کوفت میں مبتلا ہے، یا پھر ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ خاموشی کی وجہ سے اس کی ہمت بڑھتی چلی جائے اور فیٹی سے بڑھ کر وہ ظلم و استحصاں تک پہنچ جائے۔ لہذا ضروری ہے کہ اس کا ہاتھ روک دیا جائے، اگر معاف کرنے سے اصلاح ہوتی ہے تو

معاف کر دیں، اگر احساس دلانے سے اصلاح ہوتی ہے تو احساس دلائیں، اور اگر بدلہ لینے سے اصلاح ہوتی ہے تو بدلہ لے لیں۔ اب یہ فیصلہ صورت حال کو دیکھ کر کیا جائے گا کہ اس وقت کیا کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر معاف کرنے سے بہتری نہیں ہو رہی اور سرکشی کرنے والا اپنی سرکشی پر قائم ہے تو پھر احساس (point out) دلانے کی ضرورت ہے۔ اس کو مشورہ (feed back) دیں کہ دیکھیے آپ نے فلاں فلاں موقع پر میرے ساتھ یہ زیادتی کی یہ اچھی بات نہیں ہے، عمومی اطلاق نہ کریں کہ آپ ہمیشہ ہی میرے ساتھ زیادتی کرتے ہیں، بلکہ جس خاص واقعہ کی طرف اشارہ مقصود ہو اس کو متعین (exactly quote) کریں کہ کل دو پہر کو آپ نے بلا وجہ میرے بچے کو تھپڑ مارا تھا۔ ہمیں متعین (specific) ہونے کی ضرورت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ نفعی کرنے والا اُس وقت آپ سے ناراض ہو جائے لیکن ان شاء اللہ تعالیٰ بعد میں محتاط ہو جائے گا۔ جب وہ تنہائی میں سوچے گا تو اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوگا۔ اس بات کو کرنے کے لیے غصہ سے پرہیز نہایت ضروری ہے، آگ کو آگ سے نہیں بجھایا جاتا اگر سرکشی کو ختم کرنا ہے تو بالکل ٹھنڈے لہجے میں اور دھیمی آواز کے ساتھ مختصر بات پہنچادی جائے، بات کو طول نہ دیا جائے، مبالغہ نہ کیا جائے تو ان شاء اللہ تعالیٰ بہتری ہوگی۔ مسئلہ یہ ہے جب لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں میں سرکشی کرتے ہیں تو اس کو گناہ نہیں سمجھتے، تو یہ بھی نہیں کرتے، ان کو یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہم غلطی کر رہے ہیں اس لیے ان کو احساس دلانا چاہیے کہ نفعی معمولی گناہ نہیں بلکہ آخرت میں بہت بڑے نقصان کا باعث ہے۔

مطالبات میں سرکشی:

سرکشی کی ایک اور صورت جو کہ بہت عام (common) ہے اور اس کو کہیں سے بھی سرکشی نہیں سمجھا جاتا، وہ بہت زیادہ مطالبات (demands) کرنا ہے۔ یہ بھی زیادتی ہے کہ آپ کسی سے ایسی توقعات لگائے بیٹھے ہیں جن کو پورا کرنا اس کے لیے ممکن نہیں اور زیادہ مطالبات (demands) وہی کرتے ہیں جو بہت اونچی اونچی توقعات (expectations) لگاتے ہیں۔ اس روش سے بھی بچنا چاہیے۔

سرکشی ترک کرنے کے لیے صحیح انسان بننا:

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کہا کرتے تھے کہ اگر تم کو صوفی بننا ہے، عابد، زاہد بننا ہے تو بہت ساری خانقاہیں کھلی ہیں وہاں چلے جاؤ لیکن اگر انسان بننا ہے تو یہاں آ جاؤ یعنی ہماری مجلس میں

آ جاؤ اس لیے کہ یہاں انسان بنایا جاتا ہے۔ مسلمان بننا، عالم بننا، صوفی بننا تو بعد کی بات ہے، اونچے درجے کی بات ہے، پہلے انسان تو بنو، پہلے جانوروں کی صف سے تو نکل آؤ، جانوروں کے اندر سرکشی پائی جاتی ہے، پہلے دوسروں کے اوپر زیادتی کرنے سے تو بچو۔ انسان اس وقت تک انسان نہیں بنتا جب تک اس کو اسلامی معاشرت کے آداب نہ آتے ہوں، لہذا پہلے انسان بنو۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں تین قسم کے جانور پیدا فرمائے ہیں۔ جانوروں کی ایک قسم وہ ہے جو دوسروں کو فائدہ پہنچاتی ہے، ان سے شاذ و نادر ہی کسی کو نقصان پہنچتا ہے، مثلاً گائے بکری وغیرہ۔ یہ ایسے جانور ہیں جو دودھ کے ذریعے ہمیں فائدہ دیتے ہیں اور جب گائے دودھ دینا بند کرتی ہے تو ہم ذبح کر کے اس کا گوشت کھا لیتے ہیں یعنی سراسر فائدہ پہنچتا ہے۔ جانوروں کی دوسری قسم وہ ہے جو صرف تکلیف پہنچاتے ہیں اور اس کا بظاہر کوئی فائدہ نظر نہیں آتا، مثلاً سانپ، بچھو، درندے وغیرہ۔ یہ سب موزی جانور ہیں۔ جب بھی انسان کو ملیں گے تکلیف دیں گے، ڈنگ ماریں گے۔ جانوروں کی تیسری قسم وہ ہے جو نہ تکلیف دیتی ہے اور نہ فائدہ ہی پہنچاتی ہے۔ جیسے جنگل میں بسنے والے جانور، گیدڑ، لومڑی، بندر وغیرہ۔ ان سے انسان کو نہ کوئی خاص فائدہ ہے اور نہ بہت نقصان ہے۔ جانوروں کی یہ تین قسمیں بیان کرنے کے بعد امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ انسان سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں ”اے انسان! تو اشرف المخلوقات ہے اور سارے حیوانات پر تجھ کو فضیلت دی گئی ہے۔ تو اگر انسان نہیں بنتا بلکہ جانور بننا چاہتا ہے تو کم از کم پہلی قسم کا ہی جانور بن جا جو دوسروں کو صرف فائدہ پہنچاتے ہیں، کوئی نقصان نہیں پہنچاتے جیسے گائے بکری وغیرہ اور اگر تو اس سے بھی نیچے آنا چاہتا ہے تو تیسری قسم کا جانور بن جا جو نہ نقصان پہنچاتے ہیں اور نہ ہی فائدہ پہنچاتے ہیں اور اگر تو نے دوسروں کو فائدہ کے بجائے نقصان دینا شروع کر دیا تو پھر سانپ، بچھو اور درندوں کی صف میں شامل ہو جائے گا۔“

ڈسنے والے لوگ، باتوں کے چھتے تیر چلانے والے، طنز کے نشتر چھونے والے یہ سب سرکش ہیں۔ طعنے دینا بھی سرکشی کی علامت ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا بھی حساب لیا جائے گا۔ یہ دل کا مرض ہے جس کا اظہار باتوں اور حرکتوں کے ذریعے ہوتا ہے اس کا علاج یہ ہے کہ انسان قیامت کا منظر ہر وقت اپنے ذہن میں رکھے کہ جب انسان کو دوسروں کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کی قیمت اپنی نیکیوں کی شکل میں ادا کرنا ہوگی۔

قیامت میں سرکشی کا حساب:

صحیح مسلم میں حدیث ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

((لَتَوَدَّنَ الْخَفُوقَ إِلَىٰ أَهْلِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتَّىٰ يَفَادَ لِلشَّاةِ الْجَلْحَاءِ مِنَ الشَّاةِ

الْقَرْنَاءِ))^(۱)

”قیامت کے دن لازماً تمہیں حقوق ادا کرنے ہوں گے حتیٰ کہ بے سینگ والی بکری، سینگ

والی بکری سے اپنا بدلہ لے لے گی اگر اس نے دنیا میں اسے سینگ مارا ہوگا۔“

چھوٹے سے چھوٹے ظلم اور زیادتی کے فعل کا بھی حساب ہوگا اور دینے کو صرف نیکیاں ہوں گی۔ نوکروں کے ساتھ زیادتی کی جاتی ہے۔ تنخواہ وقت پر نہ دیں گے، بلاوجہ ٹالتے رہیں گے یہ بھی ان کے ساتھ زیادتی ہے۔ جب ان کا حق واجب ہو گیا، پہلی تاریخ آگئی تو معاوضہ دیدیا جائے۔ کسی بزرگ کا واقعہ آتا ہے کہ وہ بہت محتاط رہتے تھے۔ ایک دفعہ کوئی شخص ان سے کچھ مانگنے کے لیے آیا، وہ بہت اہم کام میں مصروف تھے، اس اہم کام کو چھوڑ کر انہوں نے فوراً اس کی حاجت پوری کر دی، جو رقم مانگ رہا تھا وہ دے دی تو لوگوں نے کہا اتنی بھی کیا جلدی تھی تو جواب دیا، وہ شخص میرے سامنے عاجز بن کر کھڑا تھا، میں نہیں چاہتا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ میرا اس بات پر محاسبہ کر لے کہ فلاں شخص تمہارے پاس ضرورتاً آیا تھا تم نے اُسے اتنی دیر کیوں انتظار کروایا! میں روز قیامت کے حساب سے پچنا چاہتا ہوں۔ تو سوالی کو اس کا حق جلد سے جلد دے دیا کریں، بلاوجہ منتظر نہ رکھیں، دیر نہ کریں۔ ان چند باتوں کا تعلق بھی سرکشی سے ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں اس برائی، گناہ کو پہچاننے کی توفیق عطا فرمائے اور پھر اس سے بچنے کا راستہ بھی دکھا دے۔ آمین!

خلاصہ:

ہر شخص یہ جانچے کہ مجھ میں سرکشی ہے یا نہیں، کیا میں قانون کے بارے میں یہ کہتا ہوں کہ یہ قانون تو میری سمجھ سے بالاتر ہے، میں اس پر عمل نہیں کروں گا۔ اس انداز گفتگو سے کیا پتہ چلتا ہے؟ یہی کہ ہمارے اندر بھی ایک طرح کی سرکشی ہے۔ آج کل ہر جگہ قانون توڑنے کا رجحان ہے اور قانون توڑنے سے پہلے یہی کہا جاتا ہے کہ یہ قانون ہمیں اچھا نہیں لگتا، حالانکہ کوئی قانون جب تک برقرار ہے اُسے ہر حال میں ماننا ہے۔ اسی طرح سنگل کو توڑ کر فخر محسوس کرنا اور بلاوجہ گاڑی غلط طرف

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، تحریم الظلم

چلانا بھی سرکشی ہے، یہ عادت آپ کو اچھے پڑھے لکھے لوگوں میں بھی ملے گی اور ڈرائیوروں میں تو بہت ملے گی، اس سے ان کو باختیار ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن یہ قانون کی خلاف ورزی کر کے فخر محسوس کرنا بھی سرکشی کی علامت ہے، نوکروں یا ماتحتوں پر غیر ضروری رعب جھاڑنا یا تحکمانہ لہجہ اختیار کرنا بھی سرکشی کی علامت ہے، درشت اور تلخ لہجے میں نوکروں سے بات کرنا بھی مناسب نہیں۔ ہاں اگر کوئی شخص قانون کو غلط سمجھتا ہو اور مطمئن نہ ہونے کے باوجود قانون کی پیروی (follow) کرتا ہو تو یہ سرکشی نہیں۔

چھوٹی چھوٹی باتوں پر شوہر کی مخالفت (oppose) کرنا یا ہر وقت اپنی بات منوانے کی کوشش کرنا یقیناً سرکشی ہے۔ بچوں کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کی کوشش کرنا کہ بچے ہمہ وقت سو فیصد میرے قابو میں رہیں، میرے حکم سے انھیں بیٹھیں، کھائیں پیئیں، یہ زیادتی ہے، ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ نوکروں یا ماتحتوں کی ضروریات کو نظر انداز کرنا یا ان سے غفلت برتنا بھی سرکشی ہے۔ مذاق اڑانا، نقلیں اُتارنا سو فیصد سرکشی میں شامل ہے۔ بعض لوگ بچوں کی نقلیں اُتارنے سے بھی نہیں چُوتے، بچے شرمندہ (embarrass) ہوتے ہیں، یہ بھی بچوں کے خلاف سراسر سرکشی ہے بچوں کو پڑھاتے وقت یا ہدایات دیتے وقت کڑک لہجے (tone) کے استعمال سے گریز کرنا چاہیے۔ ہاں اگر تین چار دفعہ کہنے کے باوجود بچے نہیں مان رہا تو آپ نے کڑھنگی دکھانی ہی ہے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ عام بول چال میں یہ طرز اختیار نہیں کرنا چاہیے، جیسا کہ اشھو پانی لے کر آؤ! اس کے بجائے پیار سے اور میٹھے انداز سے کہنا چاہیے۔ برائے مہربانی ذرا پانی لا دو! اور جب کسی کو اس رویے پر ٹوکا جائے تو یہ معذرت پیش کی جاتی ہے کہ ایسا نہ کریں تو بچے سنتے ہی نہیں، یہ غلط بات ہے۔ بچوں کے ساتھ اپنا لہجہ ہمیشہ دھیمار رکھیں۔ نظم و ضبط (discipline) کے نام پر دھمکیوں اور ڈانٹ پر آمادہ رہنا، چیخ و پکار کرنا، بات کا آغاز ہی دھمکی سے کرنا کہ ہوم ورک (home work) نہیں کیا تو ٹی وی نہیں دیکھ سکتے۔ بعض دفعہ بچوں کو خوفزدہ کیا جاتا ہے کہ ہماری بات نہیں مانو گے تو بوڑھا بابا لے جائے گا، کتا آجائے گا، تمہیں کھا جائے گا، بچے ڈر کر سہم جاتے ہیں۔ دراصل یہ طرح طرح کی دھمکیاں اور ڈراوے بچوں کی شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ بچوں کو رُلانا، ڈرانا، دھمکانا سرکشی ہے، قطعاً مناسب نہیں ہے۔ اسی طرح اختیار (authority) ملنے پر دوسروں کو احساس دلانا کہ تم ہمارے محتاج ہو، سراسر سرکشی ہے۔ والدین کی حکم عدولی کرنا، اُن کا کہنا نہ ماننا، بدتمیزی کرنا، پلٹ کر

جواب دینا بھی بغاوت ہے۔ کا احساس ہونا، کسی سے اختلاف (contradict) کر کے بیابا ت رد کر کے بڑا کارنامہ انجام دینے کا احساس (sense of achievement) ہونا، یہ سب سرکشی ہے۔

اس کا علاج یہ ہے کہ ماضی کی کوتاہیوں پر انسان نادم، پشیمان اور شرمندہ ہو اللہ تعالیٰ سے معافی کا خواستگار ہو اور توبہ کرے، قیامت کا منظر سامنے لائے کہ زندگی میں جو دو چار نیکیاں کر پائے ہیں ان سے بھی ہاتھ نہ دھونا پڑ جائے۔ حدیث کا مفہوم یاد رکھیں جس میں آپ ﷺ نے فرمایا ”وہ ہم میں سے نہیں جو بڑوں کی عزت نہ کرے اور چھوٹوں پر رحم نہ کرے“ فی الحال ہم یہ نہ سوچیں کہ ہمارے خلاف کون کون بغاوت کر رہا ہے بلکہ یہ سوچیں کہ میں کس کے ساتھ بغاوت کرتا ہوں یا کس کس کے ساتھ اس نامناسب رویے کا اظہار کرتا ہوں اور یہ ہونہیں سکتا کہ ہم بغاوت نہ کرتے ہوں۔ گھر میں یا گاڑی میں (AC) ہوتے ہوئے بھی دوسرے گھر والوں کو استعمال نہ کرنے دینا کہ بل (bill) زیادہ آتے ہیں بالکل سرکشی ہے۔ نوکروں کو ان کے حقوق سے محروم کرنا، سسرال والوں سے اچھا سلوک نہ کرنا یعنی ہے۔ اپنے لیے کوئی بہانہ (excuse) نہ تراشیں، خود کو معذور (justified) نہ سمجھیں کہ ہم نے تو یہ اس وجہ سے کیا یا اس وجہ سے کیا، اپنے اندر جھانکیے اور اللہ سے ڈریں کہیں وہ کوئی ایسا شخص ہم پر مسلط نہ کر دے جو نبی کرنے والا ہو۔ کسی دانانے کہا ہے کہ اوپر جاتے وقت لوگوں سے زیادتی مت کرو کیوں کہ نیچے آتے وقت ان سے ہی پالا پڑے گا۔ ایک انگریزی کا محاورہ ہے کہ

"Keep your words soft and sweet, may be you have to eat them."

ایسا تلخ زہر یلا درشت رویہ اختیار نہ کریں کہ کل کوئی آپ سے ایسا ہی سلوک کرے۔

توقعات

تزکیے کے ضمن میں اب ہم ”توقعات“ (expectations) پر بات کریں گے۔ توقع کا تعلق دل سے ہوتا ہے، یہ دل کی ایک کیفیت کا نام ہے، اس کو امید (hope) بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ صحیح توقع کیا ہوتی ہے اور توقع کی غلط شکل کیا ہوتی ہے؟ کس سے توقع رکھنی چاہیے اور کس سے نہیں۔ اس لیے کہ توقع رکھنا یا نہ رکھنا زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالتا ہے۔ بعض اوقات خوشی اور سکون کا مدار بھی توقعات پر ہو جاتا ہے کیوں کہ صحیح ہستی سے توقع رکھنا خوشی اور سکون کا باعث بنتا ہے اور غلط ہستی سے توقع رکھنا انسان کو پریشان (upset) کر دیتا ہے۔ تو ذہنی سکون کے لیے، اچھی سیرت و کردار کے لیے اور اپنے تزکیے کے لیے ہمیں اپنی توقعات کا مرکز جانچنا ہے۔

اپنے آپ سے توقع:

انسان کو خود سے یہ توقع رکھنی چاہیے کہ میں اپنے اندر بہتری لانے کے قابل ہوں۔ توقع کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیجیے، آلے (gadget) کے طور پر استعمال کیجیے اور اپنے آپ سے مہنی بر حقیقت توقع (realistic expectation) رکھیں۔ یعنی جن چیزوں کا اختیار آپ کے پاس نہیں ان کی توقع اپنے آپ سے مت رکھیے۔ کوئی ایسی چیز جو کہ آپ کے بس سے باہر ہے، پھر بھی اپنے آپ سے توقع کرنا کہ میں اس کو ٹھیک کر لوں گا یا کر لوں گی، یہ توقع لغو ہے اور نتیجے کے اعتبار سے تباہ کن ہے، ہو سکتا ہے یہ آپ کو کسی احساس کمتری (inferiority complex) میں مبتلا کرنے کا باعث بن جائے۔ اپنے اخلاق و کردار کو سنوارنا، اپنے کسی ہنر کو نکھارنا، اللہ کی عطا کی ہوئی صلاحیتوں کو بہتر (improve) کرنا انسان کے اختیار اور بس میں ہے۔ اس کی توقع رکھنی چاہیے۔ اسی طرح اپنے آپ سے یہ توقع رکھیں کہ میں اپنی کوتاہیوں پر قابو پانے کے قابل ہوں، یہ اچھی توقع ہے، مثبت رویہ (positive attitude) ہے۔ میں شریعت پر عمل کرنے کے قابل ہوں، میں جنت کے اعلیٰ درجات حاصل کرنے کے قابل ہوں، انسان اپنے آپ سے ایسی توقعات رکھے۔ جو اعلیٰ توقعات ہوتی ہیں وہ نیکی کے ارادے کو عمل میں ڈھالتی ہیں۔ اسی طرح لوگ بلند یوں کو حاصل کرنے والے (high achiever) بنتے ہیں۔ لہذا اپنے آپ سے اچھی توقع رکھنا اچھی بات ہے۔ اس کا اظہار ہمیں قرآن میں بھی ملتا ہے مثلاً سورۃ القصص میں حضرت موسیٰ ؑ کا قول آیا ہے، انہوں نے توقع ظاہر کی تھی:

{فَلَمَّا كُنَّا ظَهِيرًا لِّلْمُجْرِمِينَ} (القصص: ۱۷)

”کہ اب میں ہرگز بھی مجرموں کا مددگار نہیں بنوں گا۔“

اور سورۃ الصُّفَّت میں حضرت اسماعیل ؑ اپنے والد محترم حضرت ابراہیم ؑ سے فرماتے ہیں:

{سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ} (۱۰۲)

”اگر اللہ نے چاہا تو عنقریب آپ مجھ کو صابر پائیں گے۔“

حضرت اسماعیل ؑ کو اپنے آپ سے توقع تھی کہ اللہ نے چاہا تو میں صابر رہوں گا۔ سورۃ

کہف آیت 69 میں حضرت موسیٰ ؑ کا قول ہمیں ملتا ہے انہوں نے حضرت خضر ؑ سے کہا تھا۔

{سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا}

”بے شک آپ (ان شاء اللہ) مجھ کو صابر پائیں گے۔“

اپنے آپ سے انہوں نے اچھی امید رکھی۔ غور کریں کہ خود سے اچھی امید رکھنے سے خود

اعتمادی (confidence) پیدا ہوتی ہے، انسان اپنی صلاحیتوں کو کام میں لاتا ہے اور وہ مفید

کاموں میں لگتی ہیں۔ سورۃ یوسف میں بھی ہمیں حضرت یوسف ؑ کا قول ملتا ہے:

{قَالَ اجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلَيْكُمْ} (یوسف: ۵۵)

”کہا کہ زمین کے خزانوں کا مجھ کو انچارج بنا دیجیے، میں علم والا ہوں اور حفاظت کرنے والا ہوں۔“

ان کو اپنے آپ سے یہ توقع تھی کہ اگر مجھے یہ ذمہ داری دی جائے تو میں اس ذمہ داری کو اچھی طرح ادا کروں گا۔

اچھی توقع کا فائدہ:

اس اچھی توقع کا سب سے بڑا فائدہ کیا ہوتا ہے؟ یہ انسان کو محنت پر آمادہ کرتی ہے، فائدے

(incentive) کی امید دلاتی ہے، اور پھر وہ اس پر محنت کرنے کے لیے خوشی خوشی آمادہ ہو جاتا ہے۔

مثلاً یہ توقع رکھنا کہ اگر مجھے مال ملا تو میں اللہ کی راہ میں خرچ کروں گا، یا موقع ملا تو شہادت کا درجہ حاصل

کروں گا۔ اس توقع پر، اس ارادے پر بھی اجر ہے۔ نیکی کی نیت پر بھی نیکی لکھ دی جاتی ہے، خواہ عمل میں

نہ آسکے۔ مثلاً اگر شہادت کی تمنا اور نیت ہے تو بستر پر موت بھی شہادت میں شمار کی جائے گی۔ اور خود سے

انسان توقع رکھے کہ اگر کہیں گناہ کرنے کا موقع بھی ملا تو مجھے توقع ہے کہ میں اس سے بچ نکلوں گا اور جب

توقع رکھے یا کرے تو ”ان شاء اللہ“ ضرور کہے۔

توقعات پر پورا اُترنے کے لیے ذہنی تیاری ضروری ہے:

اپنے آپ سے توقع رکھنا ایک طرح سے ذہنی مشق (mental exercise) ہے۔

انسان ذہنی طور اپنے آپ کو تیار کر رہا ہوتا ہے اور جب وہ ذہنی طور پر تیار ہوتا ہے اور پھر کوئی حقیقی

صورت حال (real life situation) پیش آتی ہے، کوئی نیکی کا موقع ہاتھ آتا ہے یا انسان کسی آزمائش میں مبتلا ہوتا ہے تو پھر وہ بوکھلاتا نہیں ہے، بلکہ پورے اعتماد سے گزر رہتا ہے، اس لیے کہ وہ ذہنی طور پر تیار ہوتا ہے، موقع سے فائدہ اٹھالیتا ہے۔ ورنہ اگر انسان ذہنی طور پر کسی کام کے لیے تیار نہ ہو تو موقع سامنے آنے پر وہ تذبذب (hesitation) کا شکار ہو جاتا ہے، گوگو کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اتنے میں وہ موقع (opportunity) کھو بیٹھتا ہے۔ یوں سمجھیں کہ

توقع + موقع = کامیابی (expectation + opportunity = success)

تو انسان کو اپنے آپ سے اچھی امید رکھنی چاہیے۔ اپنے آپ کو خواہ مخواہ کم تر (under estimate) نہ سمجھے۔ حقیقت سے قریب امید رکھے۔ اپنے آپ کو جانچے، پرکھے کہ ہاں میں کیا کر سکتا ہوں، میرے اختیار میں کیا کیا ہے، کیا ممکن ہے۔

اللہ سے توقع:

اللہ سے توقع رکھنا بہت پسندیدہ ہے۔ اس کو قرآن میں ”توکل“ کہا گیا ہے۔ انسان کو اللہ سے توقعات رکھنی چاہئیں۔ بعض اوقات ہماری اپنی ذات ہماری توقع پر پوری نہیں اُترتی، لیکن جو توقعات انسان اللہ سے لگاتا ہے وہ لازماً پوری ہوتی ہیں بلکہ اللہ اُس کی توقعات سے بہت بڑھ کر دیتا ہے۔ اللہ سے خوب توقعات لگائے، اللہ کی اطاعت کرے، اس کے صلے میں توقع رکھے کہ مجھے اس کام کا اجر ملے گا۔ امتحانات، مشکلات اور آزمائشیں آنے پر توقع رکھے کہ اس کا صلہ مجھے اللہ دے گا، اجر ملے گا۔ جب مشکلات آئیں تو اللہ سے توقع رکھے کہ اللہ دُور کر دے گا اور اللہ سے ضرور توقع رکھے کہ اللہ میری تمنا سیں اور خواہشات ضرور پوری کرے گا۔ جب اللہ سے اتنی ساری امیدیں ہوتی ہیں تو اس کا مظہر دُعا کی شکل میں نکلتا ہے۔ توقعات کا اظہار ہے دُعا۔ یعنی جو کچھ اللہ سے امید (expect) کر رہے ہوتے ہیں اس کا اظہار ہم دعا کی شکل میں کر رہے ہوتے ہیں اور دعا تو ہے ہی عبادت، لہذا توقع بھی عبادت کا ذریعہ ہے۔ اللہ سے اچھی اچھی توقعات رکھنا انسان کو مایوسی سے بچالیتا ہے، پُر امید رکھتا ہے۔

{وَلَا تَأْيِسُوا مِنَ رَوْحِ اللَّهِ إِنَّهُ لَا يَأْيِسُ مِنَ رَوْحِ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ}

(یوسف: ۸۷)

(حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں) ”اے میرے بیٹو! اللہ کی

رحمت سے مایوس مت ہو اللہ کی رحمت سے تو صرف کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں۔“

تو اللہ سے کون تو توقع نہیں لگاتا؟ جو کافر ہوتا ہے۔ مومن تو اپنے رب سے بہت توقعات

(expectations) اور امیدیں رکھتا ہے اللہ یہ بھی دے گا، اللہ یہ بھی کرے گا۔ سورۃ الکہف آیت 16 میں اصحابِ کہف کا قول نقل ہوا ہے۔

{ فَأَوَّا إِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرُ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهِ وَيُهَيِّئُ لَكُمْ مِّنْ أَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا }
(الکہف: ۱۶)

”چلو تم غار کی طرف، تمہارا رب تم پر اپنی رحمت نازل فرمائے گا اور تمہارے معاملات میں آسانی پیدا کرے گا“

یہ اللہ سے امید تھی کہ اللہ کی خاطر ہم یہ کام کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ضرور ہماری مدد کرے گا۔ انسان کو یہ توقع پُر امید رکھتی ہے کہ ایک ذات ایسی اعلیٰ و ارفع موجود ہے جو ہر شے پر قدرت رکھتی ہے، سب دیکھ رہی ہے وہ ہماری مدد و رہنمائی کرے گی۔ اس امید پر اس کے حواس بگڑتے (nerves shatter) نہیں ہیں، مشکل آنے پر مایوسی (depression) کا شکار نہیں ہوتا، اللہ کی ذات پر امید انسان کے اعصاب مضبوط کر دیتی ہے، انسان کو ہمت اور اعتماد حاصل ہوتا ہے، کسی حال میں اس کا سر نہیں جھکتا، ہمت نہیں ہارتا اپنے رب کے ساتھ اس کا تعلق کبھی خراب نہیں ہوتا۔ صرف اس امید کی وجہ سے کہ میرا رب مجھ کو اچھا ہی دے گا۔ سورۃ مریم میں بھی ہمیں اللہ سے اس امید کا ذکر ملتا ہے جو بندہ اللہ سے لگائے رکھتا ہے۔ حضرت زکریاؑ نے اپنے رب کو پکارا:

{ عَسَىٰ أَنَا أَوْ كُونُ بِدُعَاءِ رَبِّي شَقِيًّا } (مریم: ۳۸)

”مجھے امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کر نامراد نہ رہوں گا۔“

اپنے رب کو پکار کر میں ناکام نہیں ہو سکتا، اتنی پختہ امید اور یقین تھا کہ اللہ ضرور میری دعا سنے گا اور میری مدد فرمائے گا۔ کوئی نقصان ہو جائے، کوئی مسئلہ پیش آجائے پھر توقع رکھنا کہ اللہ بہتری کرے گا اس کا ذکر ہمیں سورہ قلم میں بھی ملتا ہے:

{ عَسَىٰ رَبُّنَا أَن يُبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَا إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا رَاغِبُونَ } (۳۲)

”امید ہے ہمارا رب اس سے بہتر دے گا ہم اپنے رب سے زاری کرنے والے ہیں۔“

یہاں واقعہ کچھ یوں تھا کہ چند بھائی تھے جن کے بخل کی وجہ سے ان کا سارا باغ جل کر خاکستر ہو گیا۔ جب انہوں نے اپنے جلے ہوئے باغ کو دیکھا کہ اتنا نقصان ہو گیا تو ان کی زبان پر یہ الفاظ آئے انہوں نے کہا:

{ فَلَمَّا رَأَوْهَا قَالُوا إِنَّا لَأَنصَالُونَ ۝ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ } (قلم: ۶۷، ۶۶)

”جب انہوں نے باغ کو دیکھا تو کہا شاید ہم رستہ بھول گئے ہیں، (نہیں) بلکہ ہم محروم ہو گئے ہیں۔“

لیکن انہوں نے اس نقصان سے دل نہیں ہارا، امید قائم رکھی کہ اللہ ہی دینے والا ہے وہی لینے

والا بھی ہے۔ جب ایسی سوچ ہو تو پھر نقصان بھی قابل برداشت بن جاتا ہے، شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہیں ہوتی۔ انسان کبھی بھی پھر نقصان کے نتیجے میں ذہنی اور نفسیاتی مریض نہیں بنتا۔ بڑے سے بڑا نقصان بھی سہہ لیتا ہے کہ چلو اللہ مالک ہے وہ اور دے دے گا، ہمیں اسی کے سامنے عاجزی ظاہر کرنی ہے اور اسی سے مانگنا ہے۔ پھر اور کوئی قدم اٹھانا ہو، اللہ کی خاطر کسی نامعلوم (unknown) منزل کی طرف جانا ہو تو بھی اللہ سے امید رکھنی چاہیے۔ سورۃ الصفّت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول آتا ہے:

{ وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ } { ۹۹ }

”میں تو چل پڑا ہوں اپنے رب کی طرف عنقریب وہی مجھ کو ہدایت دے گا۔“
اللہ سے امید ہو کہ اللہ کی خاطر نکلے ہیں تو اللہ کبھی رسوا نہیں کرے گا، اللہ مجھے کبھی ناکام نہیں کرے گا اور اگر دنیا میں کوئی خطا ہو گئی ہے تو اللہ معاف کر دے گا۔ یہ امید استقامت دیتی ہے ورنہ اگر یہ امید نہ ہو کہ اللہ مجھے معاف کرے گا تو ناامیدی انسان کو مزید اندھیروں میں دھکیل دیتی ہے۔ سورۃ الشعراء کی آیت ۵۱ میں یہ مضمون آتا ہے:

{ إِنَّا نَطْمَعُ أَنْ يَغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطِيئَاتِنَا إِنَّ كُنَّا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ }

”ہم کو امید ہے ہمارا رب ہماری خطائیں بخش دے گا کہ ہم پہلے مومن ہیں۔“
یہ ان جادو گروں کا قول ہے جو فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ کرنے کے لیے بلائے تھے لیکن وہ جادو گر سمجھ گئے کہ جو کچھ حضرت موسیٰ علیہ السلام دکھا رہے ہیں وہ محض جادو نہیں ہو سکتا اور ایمان لے آئے، اپنی پچھلی زندگی پر افسوس کیا اور انہوں نے اس امید کا اظہار کیا کہ اللہ ہماری وہ غلطیاں معاف کر دے گا جو ہم سے ہو چکی ہیں۔

تو اللہ سے پُر امید رہنا انسان کو ناامیدی سے بچا لیتا ہے اور اللہ سے تعلق بہت مضبوط ہو جاتا ہے۔ ایسا تو کوئی اور رشتہ یا تعلق ہو ہی نہیں سکتا جیسا کہ خالق اور مخلوق کے درمیان ہوتا ہے۔ سورۃ طلاق میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

{ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ } { طلاق: ۳ }

”اور جو اللہ پر بھروسہ رکھے گا تو وہ اس کی کفایت کرے گا (اللہ اس کو کافی ہو جائے گا)۔“
وہ مسبب الاسباب ہے، وہ بغیر اسباب کے، جو تم چاہو گے تم کو دے دے گا، وہ کسی کا محتاج نہیں، اسباب اس کے محتاج ہیں تو خوب مانگو، خوب پکارو۔ سورۃ النساء آیت نمبر ۸ میں فرمان الہی ہے:

{ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ حَدِيثًا }

”اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی ہوگی۔“

اور ایک حدیث پاک میں ارشاد ہے:

((مَنْ لَمْ يَسْأَلِ اللَّهَ يَغْضَبْ عَلَيْهِ)) (۱)

”بے شک جس نے اللہ سے سوال نہ کیا وہ اس پر ناراض ہوگا۔“

اللہ سے نہ مانگنا، سوال نہ کرنا، دعا نہ کرنا تکبر ہے جو اللہ کو بالکل پسند نہیں۔ اللہ کا وعدہ ہے:

{اذْعُوْنِيْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ} (المؤمن: ۶۰)

”مجھے پکارو میں تمہیں جواب دوں گا، میں تمہاری سنوں گا۔“

ہمیں یقین کرنا ہے، بھروسہ کرنا ہے، وہ سنتا ہے اور حاجات پوری کرتا ہے۔ یہ اُمید یقین کے ساتھ قائم رہنی چاہیے۔ انسان مایوسی سے بچتا ہے، پُر امید رہتا ہے تو مظلومیت طاری نہیں ہوتی، خود پر ترس نہیں کھاتا (never allows self pity) مطمئن رہتا ہے، پُر سکون رہتا ہے، اللہ کی رضا میں راضی رہتا ہے اور نیکیوں پر عمل کرتے ہوئے ثابت قدم رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ اس طرح ہمیں اپنی صلاحیتوں کو پہچاننے کی توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنے آپ سے اچھی توقع رکھیں اور اللہ سے اپنی توقعات رکھیں۔

دوسروں سے توقعات:

دوسروں سے توقعات کو دو زمروں (categories) میں بانٹا جاسکتا ہے۔

(۱) اپنے فائدے کے لیے دوسروں سے توقعات لگانا۔ یہ تو محض اُداسی اور غم کا نسخہ ہے۔ مثلاً

فلاں لوگ میرے لیے یہ کر دیں گے، وہ کر دیں گے۔ یہ مجھے اچھا سمجھیں گے، میری تعریف کریں

گے، مجھے یہ دیں گے، مجھے وہ دیں گے۔ یہ توقعات انسان کو پریشان (upset) رکھتی ہیں، ان

سے بچنے کی ضرورت ہے۔ (۲) دوسروں سے ان کے فائدے کے لیے توقعات لگانا۔ یعنی انسان کو

اپنا فائدہ مطلوب نہیں ہے بلکہ ان کے فائدے کے لیے ان سے توقع لگا رہا ہے مثلاً وہ یہ کام کریں

گے تو اس سے ان کو فائدہ ہوگا، دین کا پیغام ان تک پہنچا دینا کہ اگر قبول کر لیں تو ان کا فائدہ ہوگا۔

جیسے مائیں اپنے بچوں سے توقع رکھتی ہیں کہ وہ اپنی چیزیں، اپنا بستہ، کپڑے یا کھلونے خود اپنی جگہ

پر رکھیں گے۔ تاکہ ضرورت پڑنے پر چیزیں ڈھونڈنی نہ پڑیں، وقت ضائع نہ ہو وغیرہ وغیرہ۔ تو اللہ

کے لیے بندہ دوسروں سے توقع رکھے، اوروں سے اللہ کی بندگی اختیار کرنے کی توقع رکھے۔ اس

سے آخرت میں انہی کا اجر محفوظ ہوگا اور دنیا بھی سنور جائے گی۔ ایسی توقع رکھنا احسن ہے۔

(۱) جامع الترمذی، کتاب الدعوات، باب منہ